साहित्य
آزادی مبارک
اور دوسری منتخب کہانیاں
کملیشور

آزادی مبارک

اور

دوسری منتخب کہانیاں

آزادی مبارک اور دوسری منتخب کہانیاں

مصنف

کملیشور

مرتب

خورشید عالم

ساہتیہ اکادمی

Azadi Mubarak aur doosri Muntakhab Kahaniyan : Urdu translation by Khursheed Alam of Kamleshwar's Short Stories in Hindi. Sahitya Akademi, New Delhi (2001), Rs. 50.

پہلا ایڈیشن : ۲۰۰۱ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :

رویندر بھون۔ ۳۵ فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلز آفس :

'سواتی'، مندر مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر:

جیون تارا بھون، ۲۳ اے/۴۴ ایکس، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کولکاتا ۷۰۰۰۵۳

۱۷۲، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگرہالے مارگ، دادر، ممبئی ۴۰۰۰۱۴

سینٹرل کالج کیمپس، ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر ویدھی، بنگلور ۵۶۰۰۰۱

سی۔ آئی۔ ٹی۔ کیمپس، ٹی۔ ٹی۔ ٹی۔ آئی۔ پوسٹ، تارامنی، چنئی ۶۰۰۰۱۳

قیمت : ۵۰ روپے

ISBN 81-260-1311-7

Website : http://www.sahitya-akademi.org

کمپیوٹر کمپوزنگ: محمد سالم ۲۷/۳۱۶ ترلوک پوری، دہلی ۱۱۰۰۹۱

طباعت : کلر پرنٹر، دہلی ۱۱۰۰۳۲

فہرست

آزادی مبارک

ہوا یہ کہ میں منٹو کے ساتھ گھومنے نکل پڑا۔ موقع ہی ایسا تھا۔ آزادی کی پچاسویں سالگرہ منانے کا موقع۔ یہ تو نہیں معلوم کہ ملک کون سا تھا، لیکن اتنا معلوم تھا کہ دو ملکوں میں سے کوئی بھی ایک ہو سکتا تھا، بھارت یا پاکستان۔ کیونکہ پچاس سال پہلے ایک ہی ملک دو ٹکڑوں میں آزاد ہوا تھا۔ ایک انڈیا، دیٹ از بھارت اور دوسرا پاکستان۔

تو آزادی کی پچاسویں سالگرہ پر منٹو سے ملنا لازمی تھا، کیونکہ پچاس برس پرانی اس تہذیب کا اصل عالم اور مورّخ صرف منٹو ہی ہے۔ ایک ایسی تہذیب جس نے لہو کی دیواریں اور آنسوؤں کی ندیاں ایجاد کی تھیں۔

منٹو کو دیوندر اسّر اور بلراج مینرا جانتے ہیں۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ جانتا ہے۔ اگر تم نہیں جانتے تو بدنصیب ہو۔ ہمارے تمہارے درمیان یہ کہانی تو چلتی ہی رہتی ہے۔ تو خیر۔۔۔

تو ہم لارنس باغ، نہیں نہیں جناح باغ والے علاقے میں ہی کہیں تھے۔ سامنے تھوڑی دور پر لہو کی ایک گیلی دیوار اب بھی کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میں نے پوچھا۔

ـــــ منٹو صاحب! 'کیا بے خبری کا فائدہ' والا حادثہ یہیں ہوا تھا؟

ـــــ ہاں، یہیں کہیں۔۔۔ لہو کی دیوار کے اس پار یا اُس پار۔۔۔ اس حادثے میں جو بچہ موجود تھا، اگر وہ اب بھی زندہ ہے تو وہ اب پچپن سال کا ہوگا۔ حادثے کے وقت وہ پانچ سال کا تھا۔

تبھی ایک پچپن سالہ آدمی رُک کر منٹو کو دیکھنے لگا۔

—— اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟

—— جی، آپ کو دیکھ رہا ہوں۔۔۔ کیونکہ آپ کی اس کہانی کا بچہ میں ہی ہوں اور اتفاق سے ابھی تک زندہ ہوں!

—— یہ تو تعجب کی بات ہے۔۔۔ کہتے ہوئے منٹو نے مجھے اور پھر اس پچپن سالہ شخص کو بڑی بڑی آنکھوں سے حیرانی سے دیکھا۔ اس شخص نے ہم دونوں کو خاموش دیکھا۔۔۔

تو وہ پچپن سالہ شخص درمیان میں بول پڑا ——

—— مجھے آپ کی وہ کہانی اب تک یاد ہے —— 'بے خبری کا فائدہ'۔

—— تم نے کبھی پڑھی؟

—— جب میں بارہ تیرہ سال کا تھا۔ اس وقت گھروں میں آپ کی کہانیوں پر پابندی لگی ہوئی تھی کیونکہ آپ ترقی پسند تھے۔۔۔ اور ترقی پسندوں میں آپ پر پابندی لگی ہوئی تھی کیونکہ آپ ادب اور انسان پرست تھے۔۔۔ آپ کے بارے میں یہی بتایا تھا لوگوں نے۔۔۔

منٹو کی بڑی بڑی آنکھیں اور باہر نکل آئیں۔ وہ حیرت سے بولے —— عجب انسان ہو تم۔۔۔ اس تہذیب میں پلے بڑھے ہو پھر بھی کہانیاں پڑھتے ہو؟

—— وہ تو اُس دور میں پڑھ لی تھی، اب نہیں پڑھتا۔ آپ کی کہانی تو مجھے زبانی یاد ہے۔۔۔ سناؤں۔۔۔

—— میری دلجوئی کے لیے تم جھوٹ بول رہے ہو۔۔۔

—— نہیں۔۔۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا! سن لیجیے۔۔۔ اور اُس نے کہانی سنانی شروع کر دی۔

لبلبی دبی۔ پستول سے جھنجھلا کر گولی باہر نکلی۔

کھڑکی سے جھانکنے والا آدمی اسی جگہ دوہرا ہو گیا۔

لبلبی تھوڑی دیر کے بعد پھر دبی۔ دوسری گولی بھنبھناتی ہوئی باہر نکلی۔

سڑک پر ماشکی کی مشک پھٹی۔ اوندھے منہ گرا اور اس کا لہو مشک کے پانی میں حل کر بہنے لگا۔

لبلبی تیسری بار دبی۔ نشانہ چوک گیا۔ گولی ایک گیلی دیوار میں جذب ہو گئی۔
چوتھی گولی ایک بوڑھی عورت کی پیٹھ میں لگی ــــ وہ چیخ بھی نہ سکی اور وہیں
ڈھیر ہو گئی۔
پانچویں اور چھٹی گولی بیکار گئی۔ نہ کوئی ہلاک ہوا نہ زخمی۔
گولیاں چلانے والا بھنا گیا۔ اسی وقت سڑک پر ایک چھوٹا سا بچہ دوڑتا دکھائی دیا۔
گولیاں چلانے والے نے پستول کا منہ اس کی طرف موڑ دیا۔
اُس کے ساتھی نے کہا ــــ یہ کیا کرتے ہو؟
گولیاں چلانے والے نے پوچھا ــــ کیوں؟
ــــ گولیاں تو ختم ہو چکی ہیں!
ــــ تم خاموش رہو، اتنے سے بچّے کو کیا معلوم؟
کہانی سنا کر وہ پچپن سالہ شخص داد تحسین پانے کے لیے منّو کو دیکھنے لگا ــــ ہے نا
وہی کہانی!
ــــ ہے تو وہی! کہتے ہوئے منّو نے میری طرف دیکھا۔
ــــ قریب قریب ایسا ہی کوچہ گنڈے والان میں ہوا تھا۔ ارے وہی اجمیری
گیٹ کے پاس، جہاں وشنو پربھاکر رہتے ہیں ــــ ہوا یہ تھا کہ ایک اندھیری گلی کے سنسان
موڑ پر ایک آدمی پستول چھپائے کھڑا تھا۔ جی بی روڈ کا ایک مسافر سکینہ بائی کے ساتھ آدھی
رات گزار کر واپس جا رہا تھا۔ موقع پاتے ہی اُس آدمی نے پستول مسافر کے سینے پر رکھ دی اور
دبی آواز میں چیخا ــــ
ــــ جو کچھ ہے میرے حوالے کر دو!
اور کوئی چارہ نہیں تھا، پستول سینے پر تھی۔ چیخنے چلّانے کا موقع بھی نہیں تھا۔
سکینہ بائی سے جو پیسے بچے تھے وہ، ساتھ ہی سونے کی چین و گھڑی بھی مسافر کو اتارنی پڑی۔
ــــ کچھا پہنے ہے؟ پستول والے نے دبی آواز میں کڑک کر پوچھا۔
ــــ کیوں؟ مسافر نے ڈرتے ہوئے سوال کیا۔
ــــ پینٹ اتار دے!
مسافر گھبرایا ــــ

— پینٹ۔۔۔

— ہاں، وہاں بھی تو اتاری ہوگی! اتار! پستول والے نے دھمکی دی۔

کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے پینٹ بھی اتار دی۔

پستول والے نے سامان سمیٹا اور چلنے لگا۔

— اے بھائی۔۔۔ یہ طمنچہ ہمیں دے دو۔۔۔

— کیوں کیا کرے گا۔۔۔ اس کی لبلبی خراب ہے اور نقلی بھی۔۔۔

— تو کیا ہوا۔۔۔ اس میں خوف تو ہے!

پستول والا ہنسا اور طمنچہ پھینک کر چلا گیا۔

مسافر نے طمنچہ اٹھایا اور اُس اندھیری گلی کے اُسی موڑ پر کسی اور کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا!

— انتظار کا یہ سلسلہ آزادی کے دن سے جاری ہے! منّو نے کہا اور خراماں خراماں چلنے لگے۔

کچھ ہی گز کے فاصلے پر ایک جلی ہوئی دوکان دکھائی دی۔ اس کے اندر ایک آدمی برف کی دو موٹی موٹی سلیں رکھے بیٹھا تھا۔ منّو کو جیسے ہی کچھ یاد آیا تو پچپن سالہ شخص نے یاد دلایا — یہ وہی دوکان ہے منّو صاحب جو آپ نے تب بھی دیکھی تھی۔

منّو بے ساختہ بولے — تب جو میں نے کہا تھا وہی آج بھی کہہ سکتا ہوں۔ آخر جلی ہوئی اس دوکان کو کسی طرح ٹھنڈک پہنچ ہی گئی!

کہتے ہوئے منّو کی آنکھوں میں سرد ٹھہرا سا ابھر آیا۔

میں نے چلتے چلتے کہا — منّو بھائی، کہیں ایک پیالہ کافی ہو جائے۔۔۔

— ضرور۔۔۔ ضرور۔۔۔ لیکن کچھ اور ہوتا تو۔۔۔

— وہ بھی ممکن ہے۔۔۔

— کیا میں آپ لوگوں کے ساتھ چل سکتا ہوں؟ پچپن سالہ شخص نے پوچھا۔

— ہاں، ہاں آؤ۔۔۔ تم تو اس پچاس سالہ آزادی کے چشم دید گواہ ہو۔۔۔ کہتے ہوئے منّو نے یکبارگی اس کے ماتھے کو دیکھا۔

— میاں، تمھارے ماتھے پر زخم کا یہ گہرا نشان۔۔۔

—— جی یہ ۱۹۸۴ء میں لگا تھا۔۔۔

—— ۱۹۸۴ء میں! منّو نے حیرت سے پوچھا —— ۱۹۸۴ء سے تمھیں کیا لینا دینا؟ اس سال تو اندرا گاندھی کا قتل ہوا تھا۔۔۔ اور سکھوں کا قتل عام۔۔۔

—— جی، میں اسی قتل عام میں پھنس گیا تھا۔۔۔

—— تم اس میں۔۔۔ تم اُس میں کیسے پھنس گئے؟ منّو نے اور زیادہ حیرانی سے پوچھا۔

—— جی، وہ جیت آپا ہیں نا۔۔۔

—— جیت آپا! تم تو راولپنڈی کے ہو، لیکن وہ قتلِ عام تو دلّی میں ہوا تھا۔

—— جی، وہ تو ہے، لیکن جیت آپا بھی راولپنڈی کی ہیں۔۔۔ قدیمی طور پر۔۔۔ پارٹیشن میں انھیں دلّی بھاگنا پڑا تھا۔ ان کے ماتھے پر بھی زخم کا اتنا ہی گہرا نشان ہے۔۔۔

—— پہیلیاں مت بجھاؤ۔۔۔

—— جی، یہ پہیلی نہیں حقیقت ہے۔۔۔ جیت آپا کے ماتھے پر جو نشان ہے وہ ۱۹۴۷ء میں لگا تھا! اُس پچپن سالہ شخص نے کہا۔

ہم دونوں اس پچپن سالہ شخص کی باتوں میں الجھ گئے تھے، تو منّو نے کہا ——

—— تم ان پچاس برسوں کے گواہ ہو۔۔۔ جو کچھ ہوا وہ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔۔۔ یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ تمھاری کسی جیت آپا کو کوئی زخم تقسیم کے دوران لگا ہو، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم ۱۹۸۴ء کے قتل عام کے دوران راولپنڈی سے دلّی کیسے پہنچ گئے۔۔۔؟

—— ادیب اعلیٰ! ملک ٹوٹ سکتے ہیں، یادیں نہیں ٹوٹتیں۔۔۔ لہو کی بے شمار دیواریں کھڑی ہو سکتی ہیں، مگر دیواریں آواز کو تو نہیں روک سکتیں۔۔۔ الفاظ کا فرق ہو سکتا ہے، لیکن میں پاکستان میں مہاجر تھا اور جیت آپا ہندوستان میں شرنارتھی تھی۔۔۔ میرا چھوٹا سا کنبہ کرنال ہریانہ سے راولپنڈی پہنچا تھا اور جیت آپا کا کنبہ راولپنڈی چھوڑ کر دلّی۔ تب میں پانچ سال کا تھا اور جیت آپا کی عمر شاید چھ سال رہی ہوگی۔ شاید کنبے والی بات میں غلط کہہ گیا۔ جیت آپا کے کنبے میں کل ۲۱ لوگ تھے۔ راولپنڈی سے تین میل باہر تھی جیت آپا کی بستی۔ ڈھیری۔ وہاں ان کے اینٹوں کے بھٹے تھے، جن پر پچیس تیس مزدور دن رات کام کرتے تھے۔ ان کے بھٹے اول نمبر کی اینٹوں کے لیے مشہور تھے۔ دوئم نمبر کی اینٹوں کو تڑوا کر مٹی

میں بدل دیا جاتا تھا۔

___ اتنا خیال تھا انھیں کوالٹی کنٹرول کا؟

جی ہاں، آنچ کم نہ ہونے پائے، اس کی ناپ بھٹیوں کے دہانوں سے بر گھنٹے کی جاتی تھی۔ دہانوں پر لوہے کے توے پڑے رہتے تھے اور آنچ سہتے سہتے پپڑی دار مٹھریوں جیسے لگنے لگے تھے۔ انھیں میں پڑے کنڈوں کو لوہے کی ٹیڑھی بلیوں سے اٹھا اٹھا کر آگ کی دہک کو ناپا جاتا تھا۔۔۔ ضرورت پڑتے ہی بھٹیوں میں لکڑیاں جھونکی جاتی تھیں۔۔۔ سردیوں میں قبائلی بنجارے بھٹیوں کے پاس ہی ڈیرے ڈالتے تھے۔ بھٹیوں کی تپش سے آس پاس کی دھرتی ماں کی پیٹ کی تہہ گرم رہتی تھی۔۔۔

___ تم تو بالکل کہانی کار کی طرح ساری باتیں بیان کر رہے ہو!

___ تو اور کیا کریں جناب! یادوں کے نام پر کہانیاں ہی تو بچی ہیں ہمارے پاس۔۔۔

___ بتاؤ، بتاؤ۔۔۔ آگے بتاؤ! منّو نے اس پچپن سالہ شخص کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ___ میری عینک کے شیشوں پر بھی یادوں کے بہت سے داغ ہیں۔۔۔ یادوں کے سارے گودام بھر گئے تو یہ زحمت شیشوں کو اٹھانی پڑی۔۔۔ اپنی بات کہہ کر منّو نے اس کی طرف دیکھا اور بولے ___ داستان جاری رکھو۔۔۔

پچپن سالہ شخص نے گہری سانس لے کر اندر کچھ زندہ کیا اور بولنے لگا ___

___ یہ سب تفصیل سے اس لیے ذہن میں اٹکا ہوا ہے، کیونکہ جیت آپا کے گھر والوں کا ایک بھٹہ ہمارے ابّا کے حصے میں آیا تھا۔ باقی تین بھٹوں پر اوروں نے قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن یہ تو بعد کی بات ہے۔۔۔ جیت آپا ہی نے بتایا تھا۔

ہم نے پچپن سالہ شخص کی طرف دیکھا۔ وہ بولا ___

___ اُن کے پڑوسی تھے باز خاں، جو الگ الگ منڈیوں سے پیاز خرید کر ایران کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔ ان کے شادی شدہ بیٹے ریاض خاں بیوی کے ساتھ کھلی چھت پر رات گزارتے تھے، اس لیے اولاد کی آمد میں دیر ہو رہی تھی۔۔۔ اور ایک بار تو ایسی طوفانی آندھی آئی تھی، جو ان کی بیوی کی سوزنی ہی اُڑا لے گئی تھی۔ وہ آندھی اڑی سوزنی صبح کسی اور کی چھت پر ملی تو میاں بیوی میں زبردست جھگڑا ہوا۔ بات طلاق تک پہنچ گئی۔ لیکن بعد میں یہ صاف ہو گیا تھا کہ ریاض کی بیوی کی سوزنی آندھی اُڑا لائی تھی۔ تب بات ٹھیک ہوئی اور

تبھی سے جیت آپا ریاض خاں کی بیوی کو سوزنی بھابی کہہ کر پکارتی اور چڑھاتی تھیں۔۔۔
منٹو کو ہنسی آگئی اور آنکھوں میں چمک۔۔۔انھوں نے پوچھ ہی لیا ـــــ پھر سوزنی بھابی چھت سے کہیں اتری؟

ـــــ آپ تو مذاق کرتے ہو۔۔۔ اب ہمیں کیا معلوم۔۔۔ اس نے منٹو کو دیکھتے ہوئے کہا ـــــ جیت آپا نے ہمیں اتنا ہی بتایا تھا۔۔۔

ـــــ تو پھر اُس کے بعد۔۔۔

ـــــ جیت آپا کے پتا جی نے آندھی والی رات کے بعد باز خاں کو پیش کش کی کہ بیٹے اور بہو کے لیے وہ ایک کمرہ چھت پر ڈال لیں۔ اینٹیں بھٹے سے آجائیں گی۔۔۔ گھر کی بات ہے پیسے ویسے کا سوال نہیں اٹھتا۔ دوسرے دن ہی باز خاں کے گھر کے سامنے اوّل نمبر کی اینٹوں کا چٹا لگ گیا اور شاید اُسی دن یہ اعلان ہوا کہ ملک آزاد ہونے والا ہے۔۔۔ پاکستان بننے والا ہے!

ـــــ ارے، وہ تو ہوا ہی، دنیا نے دیکھا۔ آزادی کیسے آئی۔۔۔ ہم نے بھی دو عالمی جنگوں کے بعد آزادی کو آتے دیکھا۔۔۔ اور پھر میری طرف مخاطب ہوتے ہوئے منٹو نے کہا ـــــ ارے بھئی، وہ کافی کا کیا ہوا۔۔۔ ویسے کافی سے کام چلے گا نہیں، یہ وقت تو تلخ شربت پینے کا ہے!

ـــــ تو چلیے۔۔۔وہی صحیح۔۔۔ سامنے تاج پیلس موجود ہے! میں نے کہا اور ہم تینوں ہوٹل کے سائبان سے ہوتے ہوئے لابی میں داخل ہو گئے۔ منٹو کچھ تھکے ہوئے تھے، بولے ـــــ

ـــــ تم بار کا پتہ کرو، تب تک میں آرام کر رہا ہوں!

میں بار کا راستہ معلوم کرنے کے لیے مڑنے ہی والا تھا کہ منٹو نے سوال کیا ـــــ وہ پچپن سالہ شخص کہاں گیا؟

ہم دونوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ پتہ نہیں وہ کہاں چلا گیا تھا۔

ـــــ چھوڑو۔۔۔ ساتھ رہتا تو ہم اسے بھی تلخ شربت کی جھیل میں نہلا دیتے۔۔۔ آج اسے بھی عیش کرا دیتے۔

تبھی لفٹ سے نکلتی، ساتھ والے آدمی کا ہاتھ چھڑاتی ایک بے حد خوبصورت عورت چیختی تھی ـــــ چھوڑو۔۔۔ تم کیا مجھے عیش کراؤ گے؟

ظاہر ہے ہم دونوں تیزی سے اس جانب متوجہ ہوئے۔ وہ مہذب لگتا شخص بڑی عزت اور سلیقے سے اس بے حد خوبصورت عورت کو روک رہا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ عالیشان ہوٹل میں کوئی سین کریٹ نہ ہونے پائے۔۔۔ لیکن وہ عورت اپنی رو میں اسے نظر انداز کرتی تیزی سے لابی کی طرف آئی تھی، بپھرتی ہوئی۔

ـــــ ہوگا انڈسٹریلسٹ اپنے گھر کا۔۔۔ ایسے انڈسٹریلسٹ بہت پڑے ہیں دنیا میں۔۔۔ یہ خود کو آخر سمجھتا کیا ہے۔۔۔

ـــــ کیا بات ہے شِوانی؟ ہوٹل کی وردی میں ملبوس ایک نہایت ماڈرن عورت نے اسے آکر روکا اور ٹوکا۔ وہ شاید ہوٹل کے فرنٹ ڈیسک کی انچارج تھی۔

ـــــ آخر ہوا کیا ہے؟

ـــــ یہ کپور پاگل ہوگیا ہے۔۔۔ ٹھیک ہے یہ میرے ہسبنڈ کا واقف کار ہے۔۔۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس نے ہمیں سولن میں کوٹھی لے کر دی ہے۔۔۔ ارے ہم رفتہ رفتہ اس کی قیمت چکا دیں گے۔۔۔ جب اِسے کروڑوں کے لون کی ضرورت تھی تو یہ منسٹری کا چکر کاٹتا تھا۔ بنگلے پر آکر میرے ہسبنڈ کے تلوے چاٹتا تھا۔۔۔ آج مجھے جم میں ملا۔ لیڈیز آنجلنڈ۔۔۔ پھر پول پر ملا۔۔۔ میں خود پول پر ملنے چلی گئی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آئی ہیڈ کنسلٹنڈ فار اینی تھنگ۔۔۔ مائی ہسبنڈ ڈزنٹ مائنڈ ویز ٹرائفل تھنگس، بٹ اسٹل۔۔۔

تبھی ایک اور شور اٹھا۔ ان دونوں کی باتیں شور میں ڈوب گئیں۔۔۔ آزادی کی پچاسویں سالگرہ پر نعرے لگ رہے تھے۔ اور وہاں 'آرٹ انڈیا ـ ۵۰' کا افتتاح کرنے کوئی منسٹر صاحب چلے آرہے تھے۔ عجیب سی تہماگہمی تھی۔ پورے مینجمنٹ نے منسٹر صاحب کا استقبال کیا۔ بھیڑ اندر آگئی۔ 'آرٹ انڈیا ـ ۵۰ کا افتتاح کرنے وہ بھیڑ اور اسپیشل گارڈس کے ساتھ بیسمنٹ میں اُتر گئے۔ وہ زیڈ کیٹگری والی حفاظت میں نہیں تھے۔

ہم جاکر فرنٹ ڈیسک والی انچارج لڑکی کے سامنے بیٹھ گئے۔

ـــــ کیا ہوا تھا آپ کی دوست شوانی کو؟

—— کچھ خاص نہیں۔۔۔ ڈیسک انچارج لڑکی نے کہا —— ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔۔۔

—— پھر بھی، کچھ تو ہوا ہی تھا مس لونی او برائے! منٹو نے اس کی پتلی سی نیم پلیٹ پڑھ لی تھی۔

—— ہونا کیا تھا۔۔۔ شوانی کمس فرام اے فیمس فیملی۔۔۔ اُس کا ہسبنڈ گورنمنٹ آف انڈیا میں اڈیشنل فائنس سکریٹری ہے۔ اُسے پیسے کی کیا کمی۔۔۔ اینڈ یو ہیو سین۔ شوانی کین لانچ اے تھاؤزنڈ شپس۔۔۔

—— وہ تو ہے! میں نے منٹو کی طرف دیکھ کر کہا۔ منٹو نے سر ہلایا۔

—— لیکن وہ اسٹوپڈ مین کپور۔۔۔ ہی ہیز اے کرش آن شوانی۔۔۔ فرام ایجز۔ وہ چاہتا ہے شوانی مسٹر سرین سے ڈائیورس لے لے۔۔۔

—— کپور اَن میریڈ ہے کیا؟

—— اس عمر میں اَن میریڈ کون ہوتا ہے! لونی او برائے بولی —— ہی از ویری مچ اے میریڈ مین۔۔۔ چلو یہ بھی چلتا ہے۔۔۔ پر پتہ نہیں کس جھونک میں اس نے سوئٹزرلینڈ میں ایکس ایکڑ کی اسٹیٹ اور ٹین تھاؤزینڈ ملین پرسنل اکاؤنٹ کی بات اٹھادی۔۔۔ اسٹوپڈ پگ ۔۔۔ شوانی از ریئل کلاس۔۔۔ اینڈ وہاٹ اے آنسر۔

ہم دونوں نے تیزی سے لونی او برائے کو دیکھا۔

—— وہاٹ واز ہر آنسر؟

لونی او برائے کھلکھلا کر ہنس پڑی —— شوانی کچھ بھی ہو لیکن شوانی شوانی ہے۔۔۔ اس نے کہا —— رنجیت کپور! تمھارے پاس جتنی دولت ہے، لے آؤ۔۔۔ اسے میری آنکھوں کے سامنے جلاتے جاؤ۔۔۔ جتنی دیر وہ جلے گی، میں تمھاری رہوں گی!۔۔۔ وہاٹ این آنسر! بریو شوانی! بریو! جیسے لونی او برائے شوانی کو شاباشی دے رہی تھی —— دِس اونلی اے شوانی کین سے!۔۔۔ اونلی شوانی!

تبھی منسٹر صاحب کے لوٹنے کا شور برپا ہو گیا تھا۔۔۔ ایکس کیوزمی کہتے ہوئے لونی او برائے اٹھ کر تیزی سے اُدھر چلی آئی تھی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے بیٹھے رہ گئے تھے۔۔۔

ــــ ہم کس دور میں ہیں دوست؟ منّو نے اداسی سے پوچھا تھا۔
ــــ آزادی کی نصف صدی کے جشن کے دور میں منّو بھائی!
منّو نے میری بات ان سنی کر دی اور سالگرہ کے سلسلے میں ہوٹل کی چمکتی دیوار پر گاندھی جی کی ڈانڈی مارچ کا جو موٹف بنا تھا، اسے دیکھنے میں مشغول ہو گئے۔ منّو اس موٹف کو بڑی بڑی آنکھوں سے مسلسل دیکھے جا رہے تھے۔
ــــ اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں منّو بھائی؟
ــــ یہی کہ گاندھی جی نے نمک قانون توڑ کر ہمیں نمک حلالی سکھادی! بغیر کسی بارودی جنگ کے گاندھی نے انگریزوں کے گھٹنے توڑ دیے تھے۔۔۔
میں نے انھیں غور سے دیکھا۔ وہ اپنی رَو میں بول رہے تھے ــــ
ــــ دوست! انگریزوں نے پارٹیشن کا چولہا تو جلادیا تھا، لیکن ہانڈی تو سرحدی گاندھی کے ہاتھوں میں تھی۔ انھوں نے تقسیم کے خلاف رائے شماری میں شامل ہونے سے انکار کر کے وہ ہانڈی خود جناح کے ہاتھوں میں تھمادی۔ کسان اور عوام کو تو پتہ بھی نہیں تھا۔ وہ ادھ پکی کھچڑی نہرو اور جناح نے آپس میں بانٹ لی۔۔۔ اور اس کھچڑی کا جشن ہم آج بھی منا رہے ہیں۔۔۔ چھوڑو یار۔۔۔ بار کدھر ہے، وہاں چلتے ہیں۔۔۔
ہم بار کی طرف بڑھنے لگے تو منّو صاحب نے بتایا ــــ
ــــ دوست! ایک بات معلوم ہے تمھیں؟
ــــ کیا؟
ــــ میرے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ میرا جگر چھلنی ہو چکا ہے۔ شراب نوشی ترک کر دوں۔ تو میں نے اس نیک ڈاکٹر کے سامنے اپنا ایک راز پیش کیا تھا! میں نے اسے بتایا تھا کہ میں جب اللہ میاں کی کائنات سے چلا تھا تو ایک دل اور ایک جگر اسپیر لایا تھا۔ دل تو صفیہ کے علاوہ کہیں لگا نہیں، اس لیے بچ گیا، لیکن جگر اب ساتھ نہیں دے رہا ہے، اس لیے اسے بدل دیجیے۔۔۔ میں نے اسے اسپیر جگر دیا، لیکن وہ نہیں بدل سکا۔۔۔ جاہل ڈاکٹر تھا۔۔۔ تو پھر ہوا یہی کہ ۱۹۵۵ء کی ۱۸ جنوری کو میں فوت کر گیا۔۔۔ معلوم نہیں تھا کہ موت کے بعد بھی زندگی ہوتی ہے۔۔۔ اسی زندگی کے تحت میں زندہ ہوں۔۔۔
ابھی ہم بار تک نہیں پہنچے تھے کہ درمیان میں پھر ایک ہنگامہ برپا ہوا۔ وہی آزادی

کی پچاسویں سالگرہ کا موقع۔ تیاریاں تو کئی ماہ پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں، اور اب ایم۔ٹی۔وی کی کو لہے ہلانے والی ویزس لڑکیاں اور لڑکے، گٹار پکڑے نہیں، کرکٹ بیٹ تھامے ہوٹل کی لابی پر حملہ سا کرتے چلے آرہے تھے۔

یہ عجیب نظارہ تھا۔

ہم دونوں سمجھ ہی نہیں پائے کہ اس دنیا میں جو پچاس برسوں میں بالکل بدل گئی ہے۔۔۔ یہ ہو کیا رہا ہے؟

پتہ چلا کہ پچاس سال پہلے آزاد ہوئے پاکستان کی کرکٹ ٹیم انڈیپنڈنس کپ میچ کھیلنے بھارت آئی ہوئی ہے اور اُس کے سارے کھلاڑی اسی تاج پیلس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں!

اور اس سے پہلے کہ ہم ریسپشن پر جاکر پتہ کرتے، تب تک پاکستانی ٹیم کے منیجر نسیم، کپتان رمیز راجہ، اعجاز اور دھاکڑ بلے باز انضمام الحق چاروں بار کی طرف بڑھتے نظر آئے۔

میری بھی اُن سے ملنے کی خواہش تھی۔ میں بھی منّو کے ساتھ اُدھر چل دیا۔ ملاقات ہوئی تو بہت اچھا لگا اور معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان کے اپنے پرانے گھروں اور اس وطن کو دیکھنا چاہتے ہیں جو ان کے بزرگوں کا وطن ہے۔

تیئیس سالہ انضی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ہلکی پرت اتر آئی۔ اُسی نے بتایا۔ ہم اپنے پرانے گھروں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں اجازت کی ضرورت ہے۔ ایک ہندوستانی افسر آنے والا ہے۔۔۔ یہیں کافی بار میں، وہ شاید اجازت لے کر آرہا ہے۔ ہم اُسی کے انتظار میں ہیں۔ میرا گھر گاؤں تو یہیں پاس میں ہے ـــــ ہانسی! حصار کے پاس۔۔۔

ـــــ اِسی راستے تو بابر آیا تھا اور اِسی راستے ہمایوں، شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران کی طرف بھاگا تھا۔۔۔

ـــــ وہ سلطنت جیتنے آیا ہوگا، ہم تو میچ جیتنے آئے ہیں! یہ شاید ٹیم منیجر نسیم نے کہا تھا۔

ـــــ میں یہاں سے پرانے گھر محلے کی تصویریں اتار کر لے جاؤں گا۔۔۔ میں نے اپنے ابا جان سے وعدہ کیا ہے۔ ہانسی میں ہماری حویلی تھی، ایک مزار کے پاس۔ اب پتہ

نہیں ہمارے دادا جان پیر زادہ ضیاء الحق کی کسی کو یاد بھی ہو گی یا نہیں۔۔۔وہاں کچھ مسلمان تو شاید اب بھی ہوں گے!

تو منٹو سے رہا نہیں گیا، وہ بول پڑے ــــ

ــــ میاں انضمام الحق! یادیں ہندو یا مسلمان نہیں ہوتیں۔۔۔

انضی نے فوراً بات سنبھالی ــــ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔۔۔

ــــ میں جانتا ہوں۔۔۔ جانتا ہوں برخوردار۔۔۔اور کن یادوں کے ساتھ آپ کو بھیجا ہے آپ کے والد صاحب نے!

ــــ جی، انھوں نے بتایا تھا، ہمارے محلّے کو لوگ پیر زادگان کہتے تھے۔ کچھ لوگ اسے محلہ مغل پورہ بھی پکارتے تھے۔۔۔ کیا پتہ اس محلّے کا نام بھی اب بدل گیا ہو!

ــــ نہیں، نہیں، نام وام نہیں بدلے ہوں گے۔ میرے رشتے داروں کے شہروں، محلّوں کے نام بھی نہیں بدلے ہیں۔۔۔ اُن کے خطوط میں وہی نام آتے ہیں اور انھیں پتوں پر ہم انھیں خط لکھتے ہیں! رمیز راجہ نے کہا ــــ ہمارے سسرال والوں کے نزدیکی رشتہ دار اب بھی کرنال میں رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا تھا مل کر آنا۔۔۔

انضی بڑے دھیان اور امید سے اپنے کپتان رمیز راجہ کو دیکھ رہا تھا۔

ــــ میرے اپنے خاندان کے لوگ جے پور میں ہیں! رمیز راجہ ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بتانے لگا ــــ اب دیکھیے نا، میں لاہور کا ہوں، میری ساس دہلی کی، میرے خسر صاحب کرنال کے۔۔۔ لاہور، لاہور ہے لیکن دہلی کی تہذیب میں نے اپنی بیوی سے سیکھی ہے۔۔۔ جو اُس کی رگوں میں اپنی ماں کے خون کی وجہ سے پل رہی ہے۔

دو ایک پل ٹھہر سے گئے۔۔۔

اعجاز نے وہ ٹھہراؤ توڑا ــــ جانا تو میں بھی جالندھر چاہتا ہوں، اپنے نزدیکی رشتہ داروں سے ملنے۔۔۔ لیکن وقت اور اجازت کہاں ہے؟

تبھی وہ ہندوستانی افسر سرین، ان لوگوں کو پہچانتا، ہاتھ بڑھائے، لپکتا ہوا آیا اور ہاتھ ملا کر اس نے خوشخبری دی ــــ آپ لوگوں کو اجازت مل گئی ہے!

ــــ ہرّے اکی آواز سے کافی بار گونج گیا۔

وہاں موجود لوگ مسکرانے لگے، انھیں ہرّے کی وجہ تو معلوم نہیں تھی لیکن اُن

کی مسکراہٹوں سے لگ رہا تھا کہ وہ سب کسی اچھی خبر کے احساس سے مسکرا رہے تھے۔۔۔
—— ارے نسیم بھائی کہاں ہیں؟ انصی نے کہتے ہوئے انھیں ڈھونڈا تو دیکھا کہ ہوٹل کا بیل کیپٹن انھیں ایک فیکس پیغام تھما کر واپس جا رہا ہے۔۔۔ انھیں دیکھتے ہی تینوں قریب قریب چیخ پڑے ——
—— نسیم بھائی! بھارت سرکار نے اجازت دے دی ہے!
منیجر نسیم کچھ مایوس سے وہ کاغذ لیے پاس آئے تو انصی نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے پوچھا —— نسیم بھائی! اب تو میں ہانسی جا سکتا ہوں!
—— شاید نہیں!
—— کیوں؟
—— میں نے کرکٹ کنٹرول بورڈ سے آپ لوگوں کے لیے اجازت کی سفارش کی تھی، لیکن ابھی کراچی سے اپنے کرکٹ کنٹرول بورڈ کا یہ فیکس پیغام آیا ہے۔ بورڈ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے! کہتے ہوئے منیجر نسیم نے فیکس والا کاغذ اُن کی طرف بڑھا دیا۔۔۔

—— اوہ شِٹ! کہتے ہوئے انھوں نے کاغذ وہیں میز پر پھینک دیا۔
—— پاکستان زندہ باد! منّو نے گونجتا ہوا نعرہ لگایا، کچھ ایسے جیسے وہ نشے میں ہوں۔
لوگ ایک بار پھر بری طرح چونکے۔ اس بار ان کے چہروں پر حیرانی اور ماتم تھا۔
—— تم لوگ تو نامی گرامی بھی ہو۔۔۔ یہاں اور وہاں لاکھوں معمولی لوگ اسی تکلیف سے تڑپ رہے ہیں! کہتے ہوئے منّو کی آنکھیں عینک کے شیشوں سے باہر آ رہی تھیں۔ پھر وہ مجھ سے بولے —— چلو دوست! بار میں چلو، ہم اپنی شام کیوں خراب کریں! چلو!

ہم بار کی طرف وچل دیے۔
تعجب کہ سامنے سے ہمارا پچپن سالہ ہمسفر شخص ہماری ہی طرف چلا آ رہا تھا۔ اُس نے دور سے ہمیں دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک اوھیڑ سی عورت بھی تھی۔
منّو نے چلتے چلتے غور سے اُن دونوں کو دیکھا پھر مجھے۔ منّو نے ایک بار پھر پچپن سالہ شخص اور اس کے ساتھ والی عورت کو تعجب سے دیکھا۔

— بڑا چالو لگتا ہے۔ یہ پچپن سالہ شخص کس عورت کو پکڑ لایا؟ منّو نے کہا۔

— نہ معلوم کون ہے؟

— لباس تو وردی جیسا لگ رہا ہے۔

— اسی ہوٹل میں کام کرتی ہوگی۔۔۔

— تب تو یہ ہم سے بازی مار لے گیا!

— ابھی پتہ چل جائے گا، کون ہے یہ عورت ۔۔۔ میں نے منّو کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

تب تک وہ دونوں ہم تک پہنچ چکے تھے۔

پچپن سالہ شخص نے بڑے حوصلے سے اعلان کیا۔۔۔

— یہی ہیں ہماری جیت آپا!

— وہ۔۔۔ وہ ڈھیری راولپنڈی والی!

— ست سری (۱) کال۔۔۔ جیت نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

— اتفاق دیکھیے۔۔۔ یہ یہاں مل گئیں۔۔۔ اتنے برسوں بعد! پچپن سالہ شخص نے حوصلے سے کہا۔

— آپ یہیں کام کرتی ہیں؟

— ہاں جی!

— کیا کام کرتی ہو؟

— جتنا برا اس کا سامان ہے۔۔۔ گنڈے، گملے، پیتلس۔۔۔ انھیں چمکاتی ہوں!

— کب سے ہو آپ یہاں؟

— سات آٹھ مہینے ہوئے!

— اُس سے پہلے؟

— اُس سے پہلے میں دہلی پولس کی وردیاں سلتی تھی۔

— کتنے برسوں بعد ملے ہو آپ دونوں؟

— چوراسی کے بعد۔۔۔

میں اس سے ادھر اُدھر کے سوال پوچھ ہی رہا تھا کہ دیکھا منّو بار بار اپنی عینک

صاف کر رہے تھے، صاف کرتے تھے، لگاتے تھے اور اس پچپن سالہ شخص کو دیکھتے تھے۔ پھر عینک اتارتے صاف کرتے اور اُس عورت کو دیکھتے۔ چوتھی بار دیکھنے کے بعد وہ پاس کھسک کر عورت سے بولے ـــــ

ـــــ تمھارے ماتھے پر زخم کا یہ گہرا نشان؟

ـــــ جی، یہ ۷۴ء میں لگا تھا!

ـــــ اِسی نشان کے بارے میں میں نے آپ کو بتایا تھا! پچپن سالہ شخص بیچ میں بولا۔

اور ہم دیکھتے ہی رہ گئے، حیرت سے۔ اُس پچپن سالہ شخص اور اُس عورت جیت کو۔ دونوں کے ماتھوں پر قریب قریب ایک سے گہرے نشان تھے۔ اسی بات کی اُس نے ابھی تائید کی تھی اور پہلے بھی بتایا تھا۔

اب یہ تھوڑی عجیب سی بات لگ رہی تھی، پر بات تو سامنے تھی اور یہی تھی۔

پچپن سالہ شخص کے ماتھے پر ۸۴ء کا زخم اور جیت کے ماتھے پر ۷۴ء کا زخم!

بات الجھ رہی تھی تو میں نے پچپن سالہ شخص سے پوچھ ہی لیا ـــــ

ـــــ تم یہاں ۸۴ء میں کیسے پہنچ گئے؟

ـــــ جی، وہ ایسا تھا۔۔۔

منٹو اُسے غور سے دیکھ رہے تھے ـــــ ہاں، بولو۔۔۔ بولو۔۔۔

ـــــ جی وہ ایسا تھا کہ ڈھیری راولپنڈی میں ہمارے ابّا کو انھیں کے گھر کا قبضہ ملا تھا۔ ہمارے ابّا مکان کے دروازے پر لکھ آئے تھے ـــــ پاکستان زندہ باد! الحمدللّٰہ یہ مکان سیّد انوار حسین مہاجر کرنالوی کے نام الاٹ ہو گیا ہے! اُس کے تیسرے دن ہم اس گھر میں داخل ہو گئے تھے۔۔۔ مجھے یاد ہے سب سے پہلے ابّا اور امّی نے گھر بھر میں پھیلے خون کے دھبّوں کو دھویا تھا۔

ـــــ امّی بار بار شکایت کر رہی تھیں ـــــ یہ کہاں اٹھا لائے بچوں کو۔۔۔ یہ گھر ہے کہ بوچڑ خانہ۔۔۔

جیت آنکھوں پر پلّو لگائے دھیرے دھیرے سسک رہی تھی۔

منٹو کی آنکھوں میں دھواں بھرا تھا۔ انھوں نے چشمہ پھر صاف کیا ـــــ ایک

گہری سانس لی۔ پھر دھیرے سے بولے ــــ

ــــ تمھارے ساتھ کیا حادثہ ہوا تھا؟

جیت نے آنکھیں سکھائیں۔۔۔

ــــ کیا بتاؤں، کیسے بتاؤں۔۔۔ دل دہلتا ہے۔۔۔ رُلائی روک کر جیت نے بتایا ــــ ہمارے گھر وہیں تھے ڈھیری میں۔۔۔ اینٹوں کے بھٹے تھے ہمارے۔ ہمارا پورا کنبہ وہیں رہتا تھا۔ بغل میں باز چچا کا گھر تھا۔۔۔

ــــ اُنھیں کی بہو تھی تمھاری سوزنی بھابی!

سن کر جیت کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی ــــ

ــــ لگتا ہے آپ لوگوں کو سب کچھ بتادیا ہے اس ہِمّن نے!

ــــ ہِمّن!

ــــ جی میرا نام ہے! پچپن سالہ شخص نے کہا۔

ــــ یہی رہتے ہیں اب ہمارے چھوڑے ہوئے گھروں میں۔۔۔ جیت نے کہا۔

ــــ تم لوگ گھر خود چھوڑ آئے تھے؟

ــــ اپنا گھر کون چھوڑتا ہے۔۔۔ چھوڑنا پڑا تھا۔۔۔ ہم لوگ امن چین سے رہ رہے تھے، خوش حال تھے۔ تبھی آزادی آئی۔ سارا ماحول ہی بدل گیا۔ وہ آس پاس کے گاؤں سے آئے تھے۔ ایک دن بیس بائیس لوگوں کا جتھا آیا۔ ہم لوگوں کے دلوں میں دہشت سما گیا۔ اس وقت باز چچا اور پڑوس کے لوگوں نے انھیں سمجھا بجھاکر واپس کردیا۔ پھر ہمارے کنبے کے سارے افراد رات کو ہی گھر میں جمع ہوئے۔ کل اکیس لوگ تھے ہم۔۔۔ یہی طے ہوا کہ ہم ڈھیری چھوڑ دیں گے۔۔۔

بولتے، بتاتے جیت کی آواز ٹھنڈی پڑتی جارہی تھی، سپاٹ ہوتی جارہی تھی۔ اُس میں نہ دکھ تھا نہ درد۔

ــــ لیکن چھوڑنے کے لیے انتظام ہونا تھا۔ اس میں تین چار دن لگنے ہی تھے۔ لیکن خطرہ بہت بڑھ گیا تھا، اس لیے باز چچا نے اپنی حویلی میں آنے اور رہنے کی بات کہی۔ ہم لوگ ان کی حویلی میں چلے گئے۔ کنک کی بوریاں رکھ کر انھوں نے ہمارے لیے حفاظت کی دیوار بنادی۔ رات گزر گئی۔ صبح ہم اپنے گھر میں آگئے۔ رات باز چچا کے گھر میں گزارنا ہی

ٹھیک سمجھا گیا تھا لیکن پھر دوسری رات نہیں آئی۔ دن دوپہر میں ہی پاس پڑوس کے پلدر، گاؤں سے پانچ سو لوگوں کے جتھے آگئے۔ انھوں نے ہمارے گھروں کو گھیر لیا۔ چیخ، پکار، نعرے لگنے لگے۔ ان حملہ آور جتھوں میں سے کسی نے اعلان کیا ـــــ

ـــــ باہر نکل آؤ کافرو! حلال میٹ کھاؤ اور اسلام قبول کرو تو ہم تمھیں بخش دیں گے!

ـــــ میرے پتاجی نے یہ قبول نہیں کیا۔ انھوں نے اندر سے ہی جواب دیا ـــــ نہیں! ہمیں موت قبول ہے۔ تبھی اوپر چھت ٹوٹنے لگی اور آنگن میں گولیوں کی بوچھار ہوئی۔ بے بے نے پتاجی کے پاؤں پکڑ لیے ـــــ منظور کرلو! تو تایاجی نے یہ کہتے ہوئے کہ یہ کہنا حرام ہے، اُن کی گردن کرپان سے کاٹ دی۔ تین مہینے کا میرا چھوٹا بھائی بے بے کی گود میں تھا۔ وہ خون سے تر بتر ہو گیا۔ تب تک پتاجی نے ہم سبھی کو کرپانیں تھمادی تھیں۔ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ حملہ آور اوپر سے یا دروازہ توڑ کر اندر آجائیں تو ہم بائیں طرف کرپان مارلیں۔ اتنا کہہ انھوں نے بے بے کی خون بھری اوڑھنی تلوار پر اٹھائی اور خود ہی نیم پاگل کی طرح تیزی سے باہر نکل گئے۔ چاروں طرف سے ان پر چاقوؤں، تلواروں اور برچھوں کے وار ہوئے۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ان کا یہ حال دیکھ کر تایاجی بھی کرپان لے کر باہر بھاگے۔ ان کا بھی وہی حال ہوا۔ ڈاکٹر ویرجی نکلنے لگے تو بھابی نے انھیں روکا ـــــ پہلے ہمیں ماردو، تب باہر جاؤ۔ انھوں نے بھابی کو مارا، اپنے چار سال کے بیٹے کو مارا، بہنوں کو مارا۔ میں ڈری ہوئی اندر تھی۔ ویرجی باہر نکل گئے۔۔۔ اُن کا بھی وہی حال ہوا۔ تبھی کوٹھری سے چاچی جی میری بانہہ تھامے نکلیں۔ بولیں ـــــ کیسی لڑائی لڑنے آئے ہو! مجھے اپنے بچوں کو ایک بار دیکھنا ہے! تبھی ان پر اینٹوں کی بوچھار ہوئی۔۔۔ وہیں پٹنا لگا تھا۔ کچھ دیر انھوں نے چوٹیں کھائیں، پھر گر پڑیں۔ اُن لوگوں نے ان کے گلے کی مالا، ہاتھوں کی چوڑیاں اور کان کی بالیاں کھینچ لیں۔ وہ وہیں مر گئیں۔ اسی وقت میرے ماتھے پر وار ہوا۔ پھر کیا ہوا ٹھیک سے معلوم نہیں۔ لیکن باز چچا بھی مار ڈالے گئے۔ ہمارے ایک چچا بچے تھے، وہ راولپنڈی سے ہمیں ہی لینے آرہے تھے۔ انھوں نے پورے کنبے کو لاشوں کی آگ میں جلایا اور مجھے لے کر جانے کیسے دہلی پہنچ گئے۔۔۔ پھر یہیں دہلی میں رہی۔ پھر شادی ہو گئی۔۔۔ پھر۔۔۔

کہتے ہوئے وہ چپ ہو گئی۔۔۔

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔۔۔ کسی کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ جیت کی آنکھوں میں ریت اڑ رہی تھی۔

میں نے بہت آہستہ سے خاموشی توڑی ـــــ پھر؟

جیت نے اپنی آنکھیں اوڑھنی سے ڈھانپ لیں۔ وہ شاید اب کچھ بولنا نہیں چاہتی تھی۔ منّو نے اس پچپن سالہ شخص کی طرف دیکھا۔

ـــــ میں وہیں ڈھیری میں بھٹے پر بڑا ہوا۔ جب حالات کچھ بدلے تو ڈھیرے ڈھیرے خبریں ملنی شروع ہوئیں۔ کون کہاں ہے؟ کون نہیں ہے۔ کون مر کھپ گیا۔ کئی سال بعد ایسے ہی خبر ملی کہ ڈھیری کے بھٹے والے سردار جی کی ایک لڑکی دہلی میں ہے۔ کچھ اتہ پتہ بھی ملا۔ جب گھر صاف کیا گیا تھا تو کسی موکھے میں ایک گٹھکا گرنتھ صاحب اور کچھ ٹپنے کے کاغذات ملے تھے۔۔۔

ـــــ ٹپنے کے کاغذات؟ منّو نے پوچھا۔

ـــــ جنم پتریاں۔۔۔ میں نے وضاحت کی۔

منّو کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا ـــــ مرنے والوں کی جنم پتریاں!

ـــــ جی ہاں! پچپن سالہ شخص بولا ـــــ امّی نے بھی کہا تھا، انھیں سنبھال کے رکھ دے، تیرے ابّو کو کبھی کرنال جانے کا موقع ملا تو اسی بہانے ڈھیری والوں سے بھی مل آئیں گے۔۔۔

ـــــ ڈھیری والوں سے۔۔۔ میں نے امّی سے پوچھا تھا ـــــ ڈھیری والے تو اب ہم ہیں۔ تو امّی نے بڑی آسانی سے سمجھا دیا تھا ـــــ نہیں بیٹا۔۔۔ وہ بھٹے والے دوسرے ملک چلے گئے ہیں۔۔۔ وطن تو اُن کا یہی ہے۔۔۔ جیسے تیرا کرنال۔۔۔ میں کچھ سمجھ پایا تھا، کچھ نہیں، لیکن سوچ کر اچھا ضرور لگا تھا کہ ہمارا ایک وطن بھی ہے۔

منّو نے اسے غور سے دیکھا تھا۔

ـــــ تو ابّا نہیں آپائے۔ انھیں اجازت نہیں ملی۔ سینتیس سال بعد مجھے اجازت ملی۔ تب میں بیالیس کا تھا۔ تب تک بھٹا ہمارے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ نئے مالک لاہور کے تھے۔ انھوں نے مہربانی کر کے مجھے تھوئی کا کام دے دیا تھا۔ میں مالکانہ حق چھوڑ کر اب اینٹیں تھاپنے لگا تھا۔ سانچے میں مٹی بھر کر میں نئے مالک کا نام بھی اینٹوں پر تھاپتا تھا۔۔۔

اس بار پچپن سالہ شخص کو دیکھ کر جیت نے دھیرے سے کہا ـــــ ہم بھی جینے والے کہاں رہ گئے۔ دار جی رکشہ چلاتے تھے تو میں رکشے والی ہو گئی۔۔۔ پھر درزن اور اب ان کے بعد صفائی کرنے والی۔۔۔ یہ جنّ انھیں دنوں ہمارے پاس گنگا اور جمنم پتریاں لے کر آیا تھا، جن دنوں فسادات بھڑک تھے۔۔۔

ـــــ ہاں۔۔۔ پتیّے لے کر میں اسی لیے آیا تھا تا کہ انھیں یقین ہو جائے کہ میں انھیں کے گھر سے آیا ہوں۔۔۔ ایک دن پہلے ہی اندرا گاندھی کو مار ڈالا گیا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ ان کی گلی پر جب حملہ ہوا تو میں انھیں کے گھر بیٹھا ہوا بات کر رہا تھا۔

ـــــ پولس بھی اُس دن ہمارے خلاف ہو گئی تھی۔ وہی پولس جس کی میں وردیاں سلتی تھی۔۔۔ ایک پولس والے نے ہی ہمارے دونوں بیٹوں اور دار جی کو گولیوں سے بھون دیا تھا۔ کہہ کر وہ آنکھیں دبا کر سسکنے لگی تھی۔

ـــــ وہیں کسی بلوائی نے مجھے مونا سمجھ کر وار کیا تھا۔۔۔ تبھی یہ چوٹ مجھے لگی تھی۔۔۔ میں جیسے تیسے جان بچا کر بھاگا تو ایک جگہ آگ میں گھر گیا تھا۔ جلتے ہوئے گھر کے باہر ایک بوڑھی سردارنی ہاتھوں میں کئی کڑے پہنے اُنھیں سے اپنی چھاتی پیٹتے ہوئے پاگلوں کی طرح بین کر رہی تھی ـــــ ہائے ربا! میرے تو آٹھوں چلے گئے۔۔۔ بھاگتے بھاگتے سننے کا موقع تو تھا نہیں۔۔۔ لیکن دور تک اُس آواز نے میرا پیچھا کیا ـــــ ہائے ربا! بارہ تو ملتان میں دے آئی۔۔۔ آٹھ یہاں دے دیے۔۔۔

اُس کی کلائی میں اُن آٹھوں کے کڑے تھے جو قتل کر دیے گئے تھے۔ کڑوں کی وہ آواز مجھے آج بھی سنائی پڑتی ہے۔۔۔ دل میں درد سا اٹھتا ہے۔۔۔

ـــــ اس ماتھے والے زخم میں درد نہیں ہوتا؟ منّو نے تبھی بے ساختہ پوچھا۔

پچپن سالہ شخص یکبارگی گھبرا گیا، جیسے وہ اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُس نے جیت کی طرف دیکھا۔۔۔ پھر دونوں نے ایک ساتھ ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

دونوں مجھے ایک پل کے لیے ہم شکل لگے۔ دونوں کے زخم چمک رہے تھے۔۔۔

تبھی منّو چیخ پڑا ـــــ ہندوستان زندہ باد! پاکستان زندہ باد! آزادی مبارک!

تاج پیلس کی لابی بری طرح تھرا گئی۔۔۔

ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

پچپن سالہ شخص اور جیت کے رونے کی تیز آوازیں ہمیں سنائی پڑیں۔۔۔ میں نے
پلٹ کر دیکھا، وہ دونوں خاموش تھے۔ میں نے منٹو سے پوچھا ـــــ آپ نے سنیں۔۔۔ یہ
رونے کی چیخیں کہاں سے آئی ہیں۔۔۔

ـــــ اِس پار اور اُس پار، دونوں سے! منٹو نے نیم پاگل فلسفی کی طرح کہا ـــــ
میرے دوست! صدیاں بوڑھی ہو جاتی ہیں لیکن درد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔

تب تک مینجمنٹ کے سپاہی اور وردی والے چوکیدار ہم پر حاوی ہو چکے تھے اور
ایک کڑکتی آواز آئی تھی ـــــ یہ کہاں سے گھس آئے! نکالو، اِن پاگلوں کو باہر!

اور ہمیں باہر کھدیڑ دیا گیا تھا۔ میں اُس بدحواسی میں مدد کے لیے منٹو کو تلاش کر رہا
تھا، لیکن وہ غائب تھے۔۔۔ وہ شاید پھر کہانیوں میں پناہ لے کر کتابوں میں بند ہو گئے تھے!!

کہرہ

پیرے کی بات مجھے بار بار یاد آرہی تھی ــــــ پیسے سے اجالا نہیں ہوتا! اگر ہوتا تو ہمارا ملک سورج کو خرید لیتا! لیکن تم سورج نہیں خرید سکتے۔

اس وقت ہم ایک چھوٹی سی وادی میں کھڑے ہوئے تھے۔ ریتھ بھی ساتھ تھی۔ تبھی اس وادی میں اچانک سورج ایسے نکلا، جیسے کسی نے آسمان سے تیز روشنی جلا کر ہمیں دیکھا ہو۔۔۔ پھر وہ روشنی ایک منٹ میں ہی دھیرے دھیرے بجھنے لگی تھی۔ موسم پھر ٹھنڈا اور اداس ہو گیا تھا۔

ریتھ جی نے بڑی نازکی سے پیر کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا ــــــ تم اپنے ہی ملک میں اس قدر ناراض کیوں ہو؟

ــــــ ہر نوجوان اپنے ملک سے ناراض ہے! پیرے نے تلخ سا جواب دیا تو ریتھ اسی طرح خاموش ہو گئی جیسے ہندوستانی لڑکیاں لگ بھگ چپ ہو جاتی ہیں۔۔۔ سوال اسی طرح سے آدھے ادھورے معلق رہ جاتے ہیں۔

ہوا تیکھی تھی۔ کھلی وادی میں اس تیکھی ہوا کو برداشت کرنا اب مشکل ہو رہا تھا۔ ریتھ کے کھلے بال اب اڑ رہے تھے۔ ان سے ہلکی ہلکی حرارت اور مہک کی چھوٹی چھوٹی لہریں آتیں اور سرد ہوا کی بڑی لہروں میں کھو جاتیں۔ چاروں طرف کہرا گرنے لگا تھا۔۔۔ ہمیں پت جھڑ سے بھرے جنگلوں میں سے ہوتے ہوئے واپس لوٹنا تھا۔ آخر کھلی وادی میں کوئی کب تک رک سکتا ہے۔۔۔ کچھ ایسی ہی بات پیرے نے بھی کہی تھی جو میرے لاشعور میں

قائم تھی۔ ریتھ کے پاس سے کبھی کبھی شبنم بھیگی گھاس کی بو پھوٹتی تھی، کبھی پت جھڑ کے سوکھے پتوں کی بھینی بھینی مہک۔ مجھے لگتا تھا کہ اس کی اس مہک کا کچھ حصہ میرا بھی تھا، لیکن وہ بات وہیں رکی تھی۔۔۔ مہابلیشور کی اس چٹان پر جہاں کھڑے ہو کر دونوں نے سورج غروب ہوتے دیکھا تھا۔ کوناوادی میں پورے دن گھوم کر اور تھک کر ہم دونوں لوٹے تھے۔ بات تو کچھ بھی نہیں تھی، لیکن جتنی بھی تھی اسی سے ریتھ نے سمجھ لیا تھا اور بغیر کسی بہانے کے بتادیا تھا۔ تب بالکل ایک ہندوستانی کی طرح فطرت اور اس کے دلفریب جھوٹ کو رومانی یقین میں باندھتے ہوئے اس نے کہا تھا ــــ مجھے لگتا ہے کہ کسی چٹان پر کھڑے ہو کر جو کچھ کہا جاتا ہے۔۔۔ اس کے کچھ معنی ہوتے ہیں۔۔۔

ــــ میں سمجھا نہیں!

ــــ یہی کہ میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتی!

ــــ میں نے کوئی وعدہ مانگا بھی نہیں! میں نے اُسے حیرانی سے دیکھا تھا۔

ــــ مانگا تو نہیں، لیکن تمھارا من مانگنے کے لیے تیار ہے۔۔۔ تو اچھا ہے نا کہ میں نے تمھیں پہلے ہی آگاہ کر دیا، تاکہ تمھیں برا نہ لگے۔۔۔ دیکھو 'وِی'! جب میں بھارت میں چلی تھی، تو لوازن نے پیرے سے کہا تھا۔۔۔ میرا انتظار کرنا۔۔۔ میں۔۔۔ میں اس کا انتظار کرنے کے لیے مجبور ہوں، کیونکہ میں نے اس سے کہا تھا ــــ اچھا!۔۔۔

اور تب سے مجھے معلوم ہے کہ ریتھ اور میرے درمیان کچھ بھی وقوع نہیں ہوا تھا اور وہ کسی کا انتظار کرتی رہی اور میں کسی کا۔۔۔ مہابلیشوری کی کوناوادی میں ہم دونوں پھر آدی باسیوں کے درمیان کام کرنے لوٹ گئے تھے۔۔۔ جیپ میں بیٹھے ہوئے ریتھ نے کہا تھا ــــ پتہ ہے، آسکر وائلڈ نے کیا لکھا ہے؟

ــــ کس کے بارے میں؟

ــــ اسی کے بارے میں جس کے بارے میں تم سوچ رہے تھے!

میں پھر حیرانی میں پڑ گیا۔ ریتھ ہمیشہ دل کی باتوں کو پُراسرار بنا دیتی تھی۔ وہ خود ہی بولی ــــ یہی لکھا ہے کہ شادی وہ رومانس ہے جس میں کوئی ایک اہم کردار پہلے ہی باب میں مر جاتا ہے۔۔۔

میں ریتھ کے دل میں اٹھ رہے جوار بھاٹے کو پہچان رہا تھا حالانکہ ہمارے

درمیان اس طرح کی باتوں کے لیے کوئی بہت گہری خواہش یا آرزو نہیں تھی۔۔۔ لیکن دوستوں کی طرح ہم یہ باتیں بھی کر سکتے تھے۔

—— ایک بات ہے نا؟

—— کیا؟

—— یہی کہ ایک دوسرے کو چاہنے سے زیادہ ان چیزوں اور باتوں کی ضرورت ہوتی ہے، جنھیں دونوں مل کر چاہ سکیں!

—— یا کچھ باتوں اور حالات سے ایک سی نفرت کر سکیں! میں نے بات کا رخ بدل دیا تھا۔

—— یہ تمھاری سوچ نہیں ہے!

—— تم مجھے کتنا جانتی ہو؟

—— تمھیں زیادہ نہیں، لیکن تم سے زیادہ بھارت کو جان سکی ہوں۔۔۔

اس کے کچھ دنوں بعد میں کوئنا سے لوٹ آیا تھا۔ ریتھ کا کچھ کام باقی تھا۔ وہ تین ماہ بعد لوٹی، بمبئی میں ملی۔ اس نے پیئرے سے فون پر بات کی اور چوتھے دن اپنے ملک سوئٹزرلینڈ میں لوٹ گئی۔

یہ تو اچانک ہی تھا کہ لوازن کے جس کمیون میں مجھے ٹھہرنا تھا، ریتھ اور پیئرے بھی اسی کمیون میں رہ رہے تھے۔ ہم یقین ہی نہیں کر سکے تھے کہ ہم اس طرح، ایک دوسرے کو کبھی یاد کیے بغیر، یوں مل جائیں گے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ ریتھ لوازن میں رہتی ہے، اس کا پتہ بھی میرے پاس تھا، لیکن نئے سال کا ایک کارڈ اس پتے سے لوٹ آیا تھا۔ بس، میرے اور ریتھ کے درمیان کا وہی آخری احساس تھا۔ میں نے پھر بھی کارڈ بھیجا تھا، ریتھ نے اپنے ملک پہنچ کر ایک سطر کا خط تک نہیں لکھا تھا۔ دل میں نہ کوئی ناراضگی تھی نہ اداسی۔ لیکن اس طرح ایک واقعہ کی شکل میں مل کر مجھے خوشی بہت ہوئی تھی۔۔۔ یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اتنا ڈرامائی تھا یہ ملنا کہ ہم حیران سے رہ گئے۔ پھر ریتھ نے پیئرے سے میرا تعارف کرایا تھا۔ مجھے اچھا یہ بھی لگا تھا کہ ریتھ اب پیئرے کے ساتھ تھی، یعنی مہابلیشور کی اس چٹان پر کھڑی تھی ریتھ نے جو کچھ کہا تھا، اس میں واقعی کچھ مطلب تھا۔ شادی انھوں نے بھی نہیں کی تھی۔۔۔ لیکن وہ اس کمیون کے دو افراد کی طرح الگ الگ کمروں میں رہ رہے تھے۔۔۔ ساتھ

ہونے کا یہ بے حد بے لوث سکھ تھا۔ رِتھ مجھے چائے پلانے اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ باہر شروع سردی کی تیز ہوا چل رہی تھی۔ کھڑکی سے دکھائی دیتی پہاڑیاں کہرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا وہ سفید مفلر لپیٹے تھیں۔

—— یہ کتنا عجیب ہے!

—— کیا؟

—— اس طرح ملنا! کہتے ہوئے رِتھ منتھل کی چائے بناتی رہی۔

—— ہاں! کہہ کر میں دیوار پر چپکے ایک پوسٹر کو دیکھتا رہا —— وہ ایک طنزیہ پوسٹر تھا۔ تمام بھیڑیں سر جھکائے ایک ساتھ چلی جارہی تھیں، جھنڈ کی جھنڈ!

—— ہم سیٹھوں کے سیٹھ ہیں! چائے رکھتے ہوئے رِتھ بولی۔

—— مطلب؟

—— یعنی ہم سوئٹزرلینڈ والے۔۔۔ ہم سیٹھ ملکوں کا پیسہ اپنے یہاں رکھتے ہیں ۔۔۔ہم پیسے سے پیسہ اُگاتے ہیں!

—— اور غریب ملکوں کو تمھارا ملک ہتھیاروں کے اسپیر پارٹس بیچتا ہے!

—— تاکہ غریب ممالک میں ترقی نہ ہو! یہ پیَرے کی آواز تھی۔ وہ دروازے پر دستک دے کر اندر آگیا تھا۔ رِتھ نے چائے تین حصّوں میں بانٹ دی۔ ہم چائے پینے لگے۔

—— یہ طنزیہ پوسٹر کیا ہے؟

—— یہ سوس مزدوروں کی ناکام ہڑتال پر ایک تبصرہ ہے۔ ساری بھیڑیں سر جھکائے واپس لوٹ رہی ہیں۔

—— یہ لکھا کیا ہے۔۔۔ رتوالا نارمل۔۔۔

—— یعنی سب کچھ معمول پر آگیا ہے! رِتھ نے انگریزی میں بتایا۔ چائے کے گھونٹ سے اس کے ہونٹ بھیگ کر بڑے دلکش ہوگئے تھے۔ لیکن اس ہندوستانی دل میں یہی بات بار بار اٹھتی تھی —— یہ میرے لیے نہیں ہے۔۔۔ یہ میرے لیے نہیں ہے۔۔۔ لامحویت کا ہندوستانی طریقہ۔

—— ہم دوائیں بناتے ہیں! یہ پیَرے کی آواز تھی —— پوری دنیا کو دوائیں دیتے ہیں، لیکن ہمارے پاس ہمارے مرضوں کی دوا نہیں ہے۔۔۔

ریتھ نے بڑی بے بس نگاہوں سے پیرے کو دیکھا تھا ـــــ ڈی! ہر وقت اپنے ملک سے ناراض رہنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔۔۔

اور یہ 'ڈی' سن کر میرے دل میں کچھ جھٹکا سا اٹھا تھا۔ شاید ریتھ بھول گئی تھی اس نے بھارت میں کئی بار اسی 'ڈی' سے مجھے پکارا تھا۔ لیکن پیرے نے ریتھ کی بات کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی، وہ بولا تھا ـــــ ہمارے ملک کی دوائی کمپنیوں میں سبھی پڑوسی ملکوں کے مزدور روزانہ آتے ہیں اور شام کو انٹرنیشنل ٹرینوں سے اپنے دیش گھر ور کو لوٹ جاتے ہیں۔۔۔ دوسری صبح پھر آتے ہیں۔۔۔ پھر لوٹ جاتے ہیں، پھر آتے ہیں۔۔ اسی میں دن پر دن گزر جاتے ہیں۔۔۔ آج کل تھوڑی کرائسس ہے، یوگوسلاویہ ملک ہی د کے نقشے سے مٹ گیا، سوویت یونین کی طرح۔۔۔ اب یوگوسلاو مزدور نہیں آتے۔۔۔ دوائیں بنانے کی جگہ ہاتھوں میں گن لیے اپنے ہی سربین یا کروشین یا بوسنیائی لوگوں کو رہے ہیں۔۔۔

ـــــ یہ اچھا ہے کیا؟

ـــــ اچھا ہو یا نہ ہو۔۔۔ ہم قتلوں کی مخالفت تب کرتے ہیں، جب ان کا ا ہمارے معاشی نظام پر پڑتا ہے۔ نہیں تو ہم خود قتلوں کے لیے اسلحوں کا سودا کرتے اور منافع کماتے ہیں!

ـــــ ڈی، تم بہت ناراض ہو! کہتے ہوئے ریتھ نے اس کے بالوں کو لہرا دیا۔

ـــــ چلو، انھیں گھما لائیں! پیرے نے چائے کے پیالے اٹھاتے ہوئے تجو رکھی تھی۔

اور ہم تینوں لیمان کے ساحل سے ہوتے ہوئے، چنار کے درختوں کے جھڑے زرد اور سرخ پتوں کے قالین پر سے گزر کر اس خوبصورت چھوٹی سی وادی میں آگئے تھے پہاڑ پر بسا ہے 'لوازن۔۔۔ پہاڑ بھی ہموار نہیں، اونچا نیچا۔

پیرے کا دل، لگتا تھا کہ کبھی کبھی ایک دم اچٹ جاتا تھا۔ وہ باتیں کرتے کر۔ اپنے اندر سما جاتا تھا۔ بہت خوبصورت آدمی تھا پیرے۔۔۔ لیکن اس کے اندر کیا چھپا ہوا تھ یہ مجھے تب تک نہیں معلوم تھا۔ دل میں ذرا سی دیر کے لیے یہ بھی آیا تھا کہ پیرے کہیں مج سے ہی تو جھلایا ہوا نہیں تھا؟ ریتھ نے اسے کچھ بتایا ہوگا۔۔۔ ان تھوڑے سے ہندوستا

دنوں کے بارے میں، تو کہیں اس کے دل میں میں تو نہیں کھٹک رہا تھا۔ ہوں بتانے کے لیے بھی کیا، وہ تو صرف ایک ڈرامہ تھا، جو ہم نے خود لکھا اور خود ہی کھیلا تھا۔۔۔ لیکن جس کے کرداروں کو ہم نے جیا نہیں تھا۔ یوں بھی ریتھ اور پیئرے کے گہرے تعلقات میں کوئی ممانعت یا جھجک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

دھیرے دھیرے ہم پہاڑ اور اس وادی میں اتر آئے تھے۔ پیئرے ریتھ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔

نیچے اترتے ہوئے ریتھ نے پیئرے سے پوچھا تھا ـــــ اب تمھارا دل کیا کہتا ہے؟

میں حوالہ سمجھ نہیں پایا۔ وہ بات میرے تھی بھی نہیں۔

پیئرے نے اسے بی جواب دیا ـــــ صبح تک سوچوں گا!

ـــــ تم اپنے ضمیر کو اتنا مت جھنجھوڑو!

مجھے لگا کہ یہ ان کی ذاتی گفتگو تھی، لیکن پیئرے کے جواب نے میرے قیاس کو توڑ دیا۔ وہ تلخی سے بولا ـــــ ان لوگوں نے کسی کی روح کو چھوڑا ہے کیا؟۔۔۔ روح ہے کہاں؟

ریتھ پھر ہندوستانی لڑکی کی طرح چپ ہو گئی تھی اور ہم سارے راستے لگ بھگ چپ چاپ چلتے ہوئے کیمپ میں لوٹ آئے تھے۔ شام ہو رہی تھی۔

کھانے کا بڑا کمرہ۔ وہیں نوٹس بورڈ لگا ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ ایک ساتھ کھانے کے لیے سب یہیں جمع ہوتے تھے۔ لیکن کچھ ایک اس بورڈ پر اپنی غیر موجودگی کا پیغام لکھ کر چلے گئے تھے۔ مجھے بھی دستک دے کر بلا لیا گیا تھا۔

بڑے کمرے میں یونانی گلوکار تھیوڈوراکس اور میکسیکن گلوکارہ جان بائز کی بڑی بڑی تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ وہی امریکن اور میکسیکن گلوکارہ جان بائز، جو نیگرو لوگوں کی آزادی کے لیے گاتی رہی ہے! تھیوڈوراکس کو تو یونان سے جلاوطن کیا گیا تھا۔۔۔

ـــــ ہاں! کیونکہ یہ یونان کی فوجی حکومت سے آزادی مانگتا تھا! گاتا تھا اور آزادی مانگتا تھا! یہ آواز پیئرے کی تھی۔ پتہ نہیں اس نے میرے دل کا سوال کیسے جان لیا تھا؟ اس نے جیسے سایے کو پکڑ لیا تھا۔۔۔ یہی تو ریتھ کی بھی خوبی ہے! وہ بھی دل کے سایے کو پکڑ

لیتی ہے۔۔۔

باہر کہرا گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ پہاڑیاں سیاہی اور کہرے میں چھپتی جا رہی تھیں۔ کمرہ جیسے سمٹا جا رہا تھا۔ اندھیرا بڑی چیزوں کو بھی چھوٹا کر دیتا ہے۔

میز پر بڑی کاہی رنگ کی بوتلوں الجیریا کی تبور کا شراب رکھی تھی۔ ریتھ نے مٹی کے پیالوں میں تھوڑی تھوڑی شراب ہمیں دی۔ ہم چار ہی تھے۔ میں، ریتھ، پیرے اور مائیکل۔ کسی اور کا انتظار شاید نہیں تھا۔ ریتھ نے ہی بتایا تھا کہ ماریا نے جنیوا چلی گئی تھی، اپنی کتاب کے پروف دیکھنے، نہیں تو وہ ہوتی۔ ڈینٹشن جارج پاپ میوزک کنسرٹ کے لیے یوتھ سنٹر چلا گیا تھا۔ میں ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ تب تک ریتھ نے مٹی کے بڑی پیالے میں ابلے آڑوؤں کے قاش پر سفید رم ڈال کر موم بتی سے اسے اجلا دیا تھا۔ آڑوؤں سے نکلتی لو سے کمرے میں ہاکا ہلکا نیلا اجالا سا بھر گیا تھا۔ اسی اجالے میں میں نے وہ پوسٹر دیکھا ــــ ایک بچہ منہ چڑھاتا اور بڑی شان سے زپ کھولے سُوسُو کر رہا تھا۔

ــــ یہ ٹھیک کر رہا ہے نا! پھر پیرے نے میرے دل کے سایے کو پکڑ لیا تھا۔

تبھی یکایک سناٹے کو چیرتا شور ہوا۔ سائرن کی تیز چیختی آوازوں نے کہرام مچا دیا۔

میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔ ریتھ نے موم بتیاں بجھا دیں۔ پھر ریتھ، پیرے اور مائیکل کانچ کی کھڑکیوں کے پار دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

ــــ تمھیں کب جانا تھا؟ مائیکل نے کچھ گھبرائی آواز میں پیرے سے پوچھا تھا ــــ کہیں وہ۔۔۔

ــــ نہیں! مجھے کل صبح صبح رپورٹ کرنا ہے۔ پیرے نے اسے جواب دیا تھا۔

ــــ اوہ، کرائسٹ! تب ٹھیک ہے۔ مائیکل نے راحت کی سانس لی۔ سائرن کی کہرام مچاتی آوازیں اب دور چلی گئی تھیں۔

ریتھ نے تینوں موم بتیاں پھر جلا دی تھیں۔ آڑو کے پیالے کی لپٹیں شانت ہو چکی تھیں۔

ــــ کسی کو رپورٹ کرنا ہوگا! وہ اُسے پکڑنے نکلے ہیں۔۔۔ بڑی گہری سانس لے کر پیرے بولا تھا اور میرے دل کے سائے کے سوال کو فوراً سمجھ کر اُس نے مجھے بتایا تھا ــــ

ــــ کل مجھے کمپلسری ملٹری ٹریننگ کے لیے رپورٹ کرنا ہے ــــ نہیں کروں گا

تو یہ سائرن یہاں بھی آئیں گے۔۔۔روح کی بات کروں گا تو پہلے میرا ٹرائل ہوگا۔۔۔پھر سزا۔۔۔دیکھتا ہوں۔۔۔کل صبح تک پتہ چلے گا کہ میرے پاس کوئی روح ہے یا نہیں۔۔۔

ریتھ اب بہت اداس تھی۔ وہ پیَرے کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ مائیکل نے تھیوڈوراکس کا گیت لگادیا تھا ـــــ میں اکیلا کہاں ہوں۔۔۔ میرے ساتھ ہمیشہ میرا اکیلا پن رہتا ہے۔۔۔ سوتا ہوں تو ساتھ سوتا ہے، جاگتا ہوں تو ساتھ جاگتا ہے۔۔۔ میں اکیلا کہاں ہوں۔۔۔

ریتھ نے چمچ سے آڑو کاٹا اور جلی ہوئی رم بھر کر پیَرے کے منہ سے لگادی۔ پیَرے نے بڑے پیار سے اُسے دیکھا اور آڑو کھاتے ہوئے اس کے سنہرے بال سہلاتا رہا۔ ریتھ نے کئی چمچ اسے کھلائے۔۔۔ وہ اس کے گالوں، گردن اور الجھے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہی۔

موم بتیاں قریب قریب جل چکی تھیں۔ سارڈین مچھلیوں والا پیزا، سرتے میں بھیگے کھیرے اور ابلے ہوئے آڑو کھاکر پیٹ بھر گیا تھا۔ میں مٹی کا پیالہ اٹھا کر دیکھنے لگا تو پیَرے ہی بولا تھا ـــــ یہ 'تیزے' کمیونٹی کے بنے ہیں۔۔۔اب کچھ لوگ مٹی کو پہچاننے لگے ہیں! لیکن زیادہ تر لوگ آدمی اور اس کی روح کو نہیں پہچانتے!

ـــــ میں تو تمھیں پہچانتی ہوں! ریتھ نے بڑی نزاکت سے کہا تو پیَرے کی آنکھوں میں جیسے دھواں سا امنڈ آیا۔ اس نے ریتھ کے سنہرے بال سہلائے اور اس کے ہونٹوں کے بالکل پاس اپنے ہونٹ رکھ دیے۔۔۔

تبھی ایک دم موم بتی تیز لو دے کر بجھ گئی۔

ـــــ موم بتیاں بجھنے لگیں۔۔۔اب اٹھیں! پیَرے نے کہا اور وہ بغیر کچھ کہے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ہم بھی اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے آئے۔

کمرے میں کانچ کی دیوار پر تیز سرد ہوا ٹکرا رہی تھی۔ اور پیَرے کے کمرے سے تھیوڈوراکس کی گریک آواز میں فرینچ کے وہی لفظ پھر تیرتے ہوئے آرہے تھے ـــــ میں اکیلا کہاں ہوں۔۔۔ میرے ساتھ ہمیشہ میرا اکیلا پن رہتا ہے۔۔۔

کئی بار میری نیند ٹوٹی۔ کانچ کی دیوار پر پڑے سرد ہوا کے تھپیڑے اور ان کی طوفان جیسی آواز نے کئی بار مجھے جگادیا تھا۔ جب بھی جاگا تو پیَرے کے کمرے سے آتی اس

گیت کی آواز بھی کئی بار سنائی دی۔ صبح کے قریب جب آنکھ کھلی، تب پیئرے کا کمرہ خاموش تھا۔

میں دیر سے اٹھا۔ مائیکل نے دستک دے کر اٹھایا تھا۔ ہوا اب نہیں تھی لیکن باہر گھنا کہرا ابھرا ہوا تھا۔ ریتھ نے پیالوں میں چائے ڈالی۔ ہم تین ہی تھے۔ میں نے سوچا پیئرے کا انتظار کر لوں ـــــ پیئرے کہاں ہے؟ انتظار کر لیں۔۔۔

ریتھ نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے ـــــ تم چائے پیو۔۔۔ وہ وہاں ہے۔

ـــــ کہاں؟ میں نے پوچھا۔

تو مائیکل نے نوٹس بورڈ کی طرف اشارہ کر دیا ـــــ وہاں!

بورڈ پر بڑے حروف میں لکھا تھا ـــــ گڈ بائے!!

راجانربنسیا

"ایک راجانربنسیا تھے۔" ماں کہانی سنایا کرتی تھیں۔ اُن کے آس پاس ہی چار پانچ بچے اپنی مٹھیوں میں پھول دبائے کہانی ختم ہونے پر گوروں پر چڑھانے کے لیے بے چین سے بیٹھ جاتے تھے۔ آٹے کا ایک خوبصورت سا چوک ہوتا، اُسی چوک پر مٹی کی چھ گوریں رکھی جاتیں جن میں سے اوپر والی کے بندیا اور سیندور لگایا جاتا، باقی پانچوں نیچے دبی پوجا قبول کرتی رہتیں۔ ایک طرف دیپک کی جوت غیر متحرک جلتی رہتی اور پوجا کے پوتر پانی کا گھڑا رکھا رہتا، جس پر ہلدی چونے سے بنی رولی سے سواستک کا نشان بنایا جاتا۔ سبھی بچوں کے چہرے پر پھول چڑھانے کے اتاؤلے پن کی جگہ کہانی سننے کی بے چینی آجاتی۔

"ایک راجانربنسیا تھے"۔ ماں سنایا کرتی تھیں، "اُن کے راج میں بڑی خوشحالی تھی۔ ہر طبقے کے لوگ اپنا اپنا کام کاج کرتے، کوئی بھی دکھی نظر نہیں آتا تھا۔ راجا کی ایک لکشمی سی رانی تھی، چاند سی خوبصورت اور۔۔۔ راجا اُسے بہت پیار کرتے تھے۔ راجا راج کاج کی دیکھ بھال کرتے اور اپنی رانی کے ساتھ محل میں سکھ کے ساتھ رہتے۔۔۔"

میرے سامنے میرے خیالوں کا راجا تھا، راجا جگپتی! تب جگپتی سے میری دانت کاٹی دوستی تھی، دونوں مڈل اسکول میں پڑھنے جاتے تھے۔ دونوں ایک سے گھر کے تھے، اس لیے برابر کی نبھتی تھی۔ میں میٹرک پاس کر کے ایک اسکول میں نوکر ہو گیا اور جگپتی قصبے کے ہی وکیل کے یہاں محرر۔ جس سال جگپتی محرر بنا اُسی برس پاس کے گاؤں میں اس کی شادی ہو گئی، لیکن ایسی ہوئی کہ لوگوں نے تماشا بنا دینا چاہا۔ لڑکی والوں کا کچھ وشواس تھا کہ

شادی کے بعد لڑکی کی رخصتی نہیں ہوئی۔ بیاہ ہو جائے گا اور ساتواں پھیرا تب پڑے گا جب پہلی رخصتی کی ساعت ہوگی اور تبھی لڑکی اپنی سسرال جائے گی۔ جگپتی کی بیوی تھوڑی بہت پڑھی لکھی تھی۔ لیکن گھرانے کی ریت کو کون مٹائے! بارات بنا بہو کے واپس آگئی اور لڑکے والوں نے طے کرلیا کہ اب جگپتی کی شادی کہیں اور کردی جائے گی، چاہے کانی لولی سے ہو، لیکن وہ لڑکی اب گھر میں نہیں آئے گی۔ لیکن سال ختم ہوتے ہوتے سب ٹھیک ٹھاک ہوگیا۔ لڑکی والوں نے معافی مانگ لی اور جگپتی کی بیوی سسرال آگئی۔

جگپتی کو گویا سب کچھ مل گیا اور ساس نے بہو کی بلائیں لے کر گھر کی سب چابیاں سونپ دیں۔ گرہستی کی ریت سمجھادی۔ جگپتی کی ماں نہ جانے کب سے آس لگائے بیٹھی تھی۔ اُس نے آرام کی سانس لی۔ پوجاپاٹ میں وقت گزرنے لگا۔ دوپہریں دوسروں کے گھروں کے آنگن میں بیتنے لگیں۔ لیکن سانس کی بیماری تھی انھیں، سو ایک دن انھوں نے اپنی آخری گھڑیاں گنتے ہوئے چندا کو پاس بلا کر سمجھایا ـــــ ''بٹیا جگپتی بڑے لاڈ پیار میں پلا ہے۔ تمھارے سسر کے گزر جانے کے بعد سے اس کی چھوٹی چھوٹی ضدیں پوری کرتی رہی ہوں۔۔۔ اب تم دھیان رکھنا۔'' پھر کچھ توقف کے بعد انھوں نے کہا، جگپتی کچھ اکھڑا ہوا ہے تو رشتہ داروں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا ہے۔ تمھارے باپ نے بیاہ کے وقت نادانی کی جو تمھاری رخصتی نہیں کی۔ میرے دشمن دیور جیٹھوں کو موقع مل گیا۔ طومار کھڑا کردیا کہ اب وداع کروانا ناک کٹوانا ہے۔۔۔ جگپتی کا بیاہ کیا ہوا کہ اُن لوگوں کی چھاتی پر سانپ لوٹ گیا۔ سوچا گھر کی عزت رکھنے کی آڑ میں رنگ میں بھنگ کردیں۔۔۔ اب بٹیا، اس گھر کی لاج تمھاری لاج ہے۔ آج اگر تمھارے سسر ہوتے، تو بھلا۔۔۔'' کہتے کہتے ماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور جگپتی کی دیکھ بھال اسے سونپ کر وہ سدا کے لیے خاموش ہوگئی تھیں۔

ایک ارمان ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔ جگپتی کی اولاد کو وہ چار برس انتظار کرنے کے بعد بھی گود میں نہ کھلا پائیں اور چندا نے یہ سوچ کر صبر کرلیا تھا کہ جیون بھر پوجنے کے لیے ایک پتی تو مل ہی گیا ہے۔ گھر میں جیسے مَن برستا اور پیار کی کمی نہ تھی۔ وہ خود فریبی سے یہ محسوس کرتی کہ گھر کی اندھیاری کوٹھریوں میں امن اور شانتی کا بسیرا ہے۔ گھر کی سبھی کنڈیوں کی کھنک سے اس کے کان مانوس ہوگئے تھے، ہر دروازے کی چرچراہٹ سے وہ آشنا تھی۔۔۔

"ایک روز راجا شکار پر گئے،" ماں سناتی تھیں، "راجہ شکار پر جاتے تھے تو ساتویں دن ضرور محل میں لوٹ آتے تھے۔ لیکن اس دفعہ جو گئے تو ساتواں دن بھی نکل گیا اور راجا نہیں لوٹے۔ رانی بڑی فکر میں پڑ گئیں۔ رانی ایک وزیر کو ساتھ لے کر کھوج میں نکلیں۔۔۔"

اور اسی بیچ جگپتی کو رشتے داری کی ایک شادی میں جانا پڑا۔ اس کے دور کے رشتے کے بھائی دیارام کی شادی تھی۔ کہہ گیا تھا کہ دسویں دن ضرور واپس آ جائے گا۔ لیکن چھٹے دن ہی خبر ملی کہ بارات گھر واپس لوٹنے پر دیارام کے گھر پر ڈاکہ پڑ گیا۔ کسی مخبر نے ساری خبریں پہنچا دی تھیں کہ لڑکی والوں نے دیارام کا گھر سونے چاندی سے پاٹ دیا ہے۔۔۔ آخر پشتوں سے چلے آئے زمیندار کی اکلوتی بیٹی تھی۔ گھر آئے مہمان لگ بھگ وداع ہو چکے تھے۔ دوسرے روز جگپتی بھی نکلنے والا تھا لیکن اسی رات ڈاکہ پڑا۔ جوان آدمی بھلا خون مانتا ہے! ڈاکوؤں نے جب بندوقیں چلائیں، تو سب کی گھگی بندھ گئی لیکن جگپتی اور دیارام نے چھاتی ٹھونک کر لاٹھیاں اٹھالیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ ڈاکو برابر گولیاں داغ رہے تھے۔ باہر کا دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔ جگپتی نے جوانوں کی ہمت بندھاتے اور للکارتے ہوئے کہا، "یہ ہوائی بندوقیں ان تیل پلائی لاٹھیوں کا مقابلہ نہیں کر پائیں گی!"

لیکن دروازے تڑتڑ ٹوٹتے رہے اور آخر کار ایک گولی جگپتی کی ران کو چھید کر نکل گئی دوسری اس کی جانگھ کے اوپر کولھے میں سما کر رہ گئی۔

چندا روئی پیٹتی منتیں مانگتی جب وہاں پہنچی تو جگپتی اسپتال میں تھا۔ دیارام کو تھوڑی سی چوٹ آئی تھی۔ اسے اسپتال سے چھٹی مل گئی تھی۔ جگپتی کی دیکھ بھال کے لیے وہیں اسپتال میں مریضوں کے رشتہ داروں کے لیے بنی کوٹھریوں میں سے ایک میں چندا کو رکنا پڑا۔ قصبے کے اسپتال سے دیارام کا گاؤں چار کوس پر تھا۔ دوسرے تیسرے وہاں سے آدمی آتے جاتے رہتے تھے۔ جس سامان کی ضرورت ہوتی، پہنچ جاتا۔

لیکن دھیرے دھیرے ان لوگوں نے بھی خبر لینا چھوڑ دیا۔ ایک دن میں ٹھیک ہونے والا زخم تو تھا نہیں۔ جانگھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور کولھے میں آپریشن سے چھ انچ گہرا گھاؤ ہو گیا تھا۔

قصبے کا اسپتال تھا۔ کمپاؤنڈر ہی مریضوں کی دیکھ بھال کرتے۔ بڑا ڈاکٹر تو نام کے لیے تھا یا قصبے کے بڑے آدمیوں کے لیے۔ چھوٹے لوگوں کے لیے تو "کمپوٹر" صاحب ہی ایشور کا اوتار تھے۔ مریضوں کی دیکھ بھال کرنے والے رشتہ داروں کی کھانے پینے کی مشکلات سے لے کر مریضوں کی نبض تک سنبھالتے تھے۔ چھوٹی سی عمارت میں اسپتال آباد تھا۔ مریضوں کی صرف چھ سات کھاٹیں تھیں۔ مریضوں کے کمرے سے لگا دوا بنانے کا کمرہ تھا، اسی میں ایک طرف آرام کرسی تھی اور ایک نیچی سی میز۔ اسی کرسی پر بڑا ڈاکٹر آکر کبھی کبھی بیٹھتا نہیں تو بچن سنگھ کمپاؤنڈر ہی جمے رہتے۔ اسپتال میں یا تو فوجداری کے شہید آتے یا گر گرا کر ہاتھ پیر توڑ لینے والے ایک آدھ لوگ۔ سال چھ ماہ میں کوئی عورت نظر آگئی تو آگئی جیسے بیماری انھیں گھیرتی ہی نہیں تھی۔ کبھی کوئی بیمار پڑتی تو گھر والے حال بتا کر آٹھ دس روز کی دوا ایک ساتھ لے کر جاتے اور پھر اس کے جینے مرنے کی خبر تک نہیں ملتی۔

اُس دن بچن سنگھ جگپتی کے گھاؤ کی پٹی بدلنے آیا۔ اُس کے آنے اور پٹی کھولنے میں کچھ ایسی لاپروائی تھی جیسے غلط بندھی پگڑی کو ٹھیک سے باندھنے کے لیے کھول رہا ہو۔ چندا اس کی کرسی کے پاس ہی سانس روکے کھڑی تھی۔ وہ دوسرے مریضوں سے بھی بات کرتا جا رہا تھا۔ ادھر منٹ بھر کے لیے دیکھتا پھر مہارت سے اُس کے ہاتھ کام کرنے لگتے۔ پٹی ایک جگہ خون سے چپک گئی تھی، جگپتی بری طرح کراہ اٹھا۔ چندا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ بچن سنگھ نے چونک کر دیکھا تو چندا منہ میں دھوتی کا پلو کھونسے اپنی خوفزدہ آواز دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جگپتی ایک بار مچھلی کی طرح تڑپ کر رہ گیا۔ بچن سنگھ کی انگلیاں تھوڑی سی تھر تھرائیں اور اس کے ہاتھ پر چندا کا آنسو گر پڑا۔

بچن سنگھ کے بدن میں ایک ٹھنڈی لہر سی دوڑ گئی اور اس کے تجربہ کار ہاتھوں کی مہارت کو جیسے کسی روحانی ملائمت نے دھیرے سے چھو لیا ہو۔ آہوں، کراہوں، پُر درد چیخوں اور ٹوٹتے ہوئے جسموں کے جس ماحول میں رہتے ہوئے بھی وہ اس سے الگ رہتا تھا، پھوڑوں کو پکے آم سا دبا دیتا تھا، کھال کو آلو کی طرح چھیل دیتا تھا۔۔۔ اُس کے دل سے جیسے درد کا احساس ہی اٹھ گیا تھا لیکن آج وہ احساس پھر بیدار ہو گیا اور وہ بچے کی طرح پھونک پھونک کر پٹی کو نم کر کے کھولنے لگا۔ چندا کی جانب دھیرے سے نگاہ کرتے ہوئے پھسپھسایا،

"چ۔۔۔چ۔۔۔ مریض کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے ایسے۔"

لیکن جیسے یہ کہتے ہوئے اس کا دل اپنی بات سے اُچٹ گیا۔ یہ لاپروائی تو چیخوں اور کراہوں کی یکسانیت سے اسے ملی تھی۔ مریض کی ہمت بڑھانے کے احساسِ فرض سے نہیں۔ جب تک وہ زخم کی مرہم پٹی کرتا رہا تب تک اُنھیں دو آنکھوں کا درد اسے گھیرے رہا۔

اور ہاتھ دھوتے وقت وہ چندا کی اُن چوڑیوں سے بھری کلائیوں کو بلا جھجک دیکھتا رہا جو اپنی خوشی اس سے مانگ رہی تھیں۔ چندا اپانی ڈالتی جارہی تھی اور بچن سنگھ ہاتھ دھوتے دھوتے اس کی کلائیوں، ہتھیلیوں اور پیروں کو دیکھتا جارہا تھا۔ دواخانے کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے چندا کو ہاتھ کے اشارے سے بُلا کر کہا "دل چھوٹا مت کرنا۔۔۔ جانگھ کا گھاؤ تو دس روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔ کولھے کا زخم کچھ دن ضرور لے گا۔۔ اچھی سے اچھی دوا دوں گا۔ دوائیاں تو ایسی ایسی ہیں کہ مُردے کو بھلا چنگا کر دیں۔ لیکن ہمارے اسپتال میں نہیں آتیں، پھر بھی۔۔۔"

"تو کسی دوسرے اسپتال سے نہیں آسکتیں وہ دوائیاں؟" چندا نے پوچھا۔

"آتو سکتی ہیں پر مریض کا اپنا پیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے اُن میں۔۔۔" بچن سنگھ نے کہا۔

چندا چپ رہ گئی تو بچن سنگھ کے منہ سے بے اختیار نکل ہی پڑا، "کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا۔۔۔ رہیں دوائیاں، سو کہیں نہ کہیں سے انتظام کر کے لاؤں گا۔ محکمے سے منگائیں گے تو آتے آتے مہینوں لگ جائیں گے۔ شہر کے ڈاکٹر سے منگا دوں گا۔ طاقت کی دوائیوں کی بڑی ضرورت ہے اُنھیں۔ اچھا، دیکھا جائے گا،" کہتے کہتے وہ رک گیا۔

چندا نے احسان مند نظروں سے اُسے دیکھا اور اُسے لگا جیسے آندھی میں اڑتے پنچھی کو کوئی سہارا مل گیا ہو۔ آکر وہ جگپتی کی کھاٹ سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کی ہتھیلی لے کر وہ سہلاتی رہی۔ ناخنوں کو اپنے پوروں سے دباتی رہی۔

دھیرے دھیرے باہر اندھیرا بڑھتا گیا۔ بچن سنگھ تیل کی لالٹین لا کر مریضوں کے کمرے کے کونے میں رکھ گیا۔ چندا نے جگپتی کی کلائی دباتے دباتے دھیرے سے کہا، "کمپاؤنڈر صاحب کہہ رہے تھے۔۔۔" اور اتنا کہہ کر وہ گویا جگپتی کو متوجہ کرنے کے لیے چپ

ہو گئی۔

"وہ کیا کہہ کہہ رہے تھے؟" جگپتی نے اداس سی آواز میں کہا۔

"کچھ طاقت کی دوائیں تمھارے لیے ضروری ہیں!"

"میں جانتا ہوں!"

"لیکن۔۔۔"

"دیکھو چندا، چادر کے برابر ہی پیر پھیلائے جا سکتے ہیں۔ ہماری اوقات ان دواؤں کی نہیں ہے۔۔۔"

"اوقات آدمی کی دیکھی جاتی ہے کہ پیسے کی، تم تو۔۔۔"

"دیکھا جائے گا!"

"کمپاؤنڈر صاحب انتظام کر دیں گے۔ اُن سے کہوں گی میں۔"

"نہیں چندا ادھار کھاتے سے میرا علاج نہیں ہوگا۔۔۔ چاہے ایک کے چار دن لگ جائیں۔"

"اس میں تو۔۔۔"

"تم نہیں جانتیں، قرض کوڑھ کا روگ ہوتا ہے، ایک بار لگنے سے تو تن تو گلتا ہی ہے من بھی روگی ہو جاتا ہے۔"

"لیکن۔۔۔" کہتے کہتے وہ رک گئی۔

جگپتی اپنی بات پر اڑا رہنے کے لیے منہ پھیر کر لیٹ گیا۔

اور تیسرے روز جگپتی کے سرہانے کئی طاقت کی دوائیں رکھی تھیں، اور چندا کی کوٹھری میں اس کے لیٹنے کے لیے ایک کھاٹ پہنچ گئی تھی۔ چندا جب آئی تو جگپتی کے چہرے پر ذہنی اذیت کی اَن گنت لکیروں کا جال بچھا تھا، جیسے وہ اپنی بیماری سے لڑنے کے علاوہ خود اپنی آتما سے بھی لڑ رہا ہو۔۔۔ چندا کی نادانی اور پیار سے الجھ رہا ہو۔ اور سب سے بڑھ کر مدد کرنے والے کی مہربانی سے بھی دست و گریباں ہو۔

چندا نے دیکھا تو جیسے وہ یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکی۔ اس کے جی میں آیا کہ کہہ دے، کیا آج تک تم نے کبھی کسی سے ادھار پیسے نہیں لیے؟ پر وہ تو خود تم نے لیے تھے اور تمھیں میرے سامنے اس کا اقرار نہیں کرنا پڑا تھا۔ اسی لیے لیتے وقت جھجک محسوس نہیں

ہوئی لیکن آج مہ ے سامنے تمھاری جھوٹی مردانہ خودداری تلملا اٹھی ہے۔ لیکن جگپتی کے منہ پر بکھری ہوئی اذیت میں جس اصول پسندی کی گہرائی تھی، وہ چندا کے دل میں چور کی طرح گھس گئی اور بڑی اپنائیت سے اس نے کہا، "یہ دوائیں کسی کی مہربانی نہیں ہیں۔ میں نے ہاتھ کا کڑا بیچنے کو دے دیا تھا، اُسی سے آئی ہیں۔"

"مجھ سے پوچھا تک نہیں اور۔۔۔" جگپتی نے کہا اور جیسے خود دل کی کمزوری کو دبا گیا ــــ کڑا بیچنے سے تو اچھا تھا کہ بچن سنگھ کی مہربانی ہی اوڑھ لی جاتی۔ اور اسے ہلکا سا پچھتاوا بھی تھا کہ ناحق وہ رو میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتا ہے، عالموں کی طرح نصیحت کرنے لگتا ہے۔

اور جب چندا اندھیرا ہوتے اٹھ کر اپنی کوٹھری میں سونے کے لیے جانے لگی تو کہتے کہتے یہ بات دبا گئی کہ بچن سنگھ نے اس کے لیے ایک کھاٹ کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ کمرے سے نکل کر سیدھی کوٹھری میں گئی اور ہاتھ کا کڑا لے کر سیدھے دواخانے کی طرف چلی گئی جہاں بچن سنگھ اکیلا ڈاکٹر کی کرسی پر آرام سے ٹانگیں پھیلائے لیمپ کی زرد روشنی میں لیٹا تھا۔ جگپتی کا رویہ چندا کو لگ گیا تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ کیوں بچن سنگھ کا احسان ابھی سے لادے۔ پتی کے لیے زیور کی کیا اوقات ہے! وہ بے دھڑک سی دواخانے میں گھس گئی۔ دن کی پہچان کی وجہ سے اسے کمرے کی میز کرسی اور دواؤں کی الماری کہاں دھری ہے اُس کا اندازہ تھا، ویسے کمرہ اندھیرا ہی پڑا تھا۔ کیونکہ لیمپ کی روشنی صرف اپنے حلقے کو زیادہ منور کر کے کونوں کے اندھیرے کو مزید گہرا کر رہی تھی۔ بچن سنگھ نے چندا کو گھستے ہی پہچان لیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چندا نے اندر قدم تو رکھ دیا لیکن اچانک سہم گئی، جیسے وہ کسی اندھے کنوئیں میں خود ہی کود پڑی ہو، ایسا کنواں جو مسلسل تنگ ہوتا گیا ہو۔۔۔ اور جس میں پانی کی گہرائی پاتال کی پرتوں تک چلی گئی ہو، جس میں گر کر وہ نیچے دھنستی چلی جا رہی ہو، نیچے۔۔۔ اندھیرا۔۔۔ تنہائی گھٹن۔۔۔ پاپ!

بچن سنگھ حیرت سے تاکتا رہ گیا اور چندا ایسے لوٹ گئی جیسے کسی سیاہ بھوت کے پنجوں سے نجات مل گئی ہو۔ بچن سنگھ کے سامنے لمحے بھر میں ساری صورت حال کوند گئی اور اس نے وہیں انتہائی سرگوشیانہ انداز میں کہا ــــ "چندا!" وہ آواز اتنی بے آواز تھی اور بے معنی ہوتے ہوئے بھی اتنی بامعنی تھی کہ وہ خاموشی پُر معنی ہو گئی۔

چندا رک گئی۔

بچن سنگھ اس کے قریب چلا گیا۔

سامنے کا گھنا پیڑ بے سدھ کھڑا تھا، اس کی سیاہ پر چھائیوں کا دائرہ گویا یکبارگی پھیل کر انھیں اپنے حلقے میں سمیٹ لیتا اور دوسرے ہی لمحے آزاد کر دیتا۔ دواخانے کا لیمپ اچانک بھڑک کر رہ گیا اور مریضوں کے کمرے سے ایک کراہ کی آواز دور ویرانے کے اختتام پر جا کر کہیں ڈوب گئی۔

چندا نے ویسے ہی نیچے تاکتے ہوئے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا، "یہ کڑا تمھیں دینے آئی تھی۔"

"تو واپس کیوں چلی جا رہی تھیں؟"

چندا خاموش رہی پھر کچھ توقف کے بعد اس نے اپنے ہاتھ کا سونے کا کڑا دھیرے سے اس کی جانب بڑھا دیا گویا دینے کی ہمت نہ ہوتے ہوئے بھی یہ کام ضروری تھا۔

بچن سنگھ نے اس کے سراپا کو ایک بار دیکھا اور پھر اپنی آنکھیں اس کے سر پر جما دیں، اُس کے سر پر پڑے کپڑے کے اندر نرم چکنائی سے بھرے لمبے لمبے بال تھے، جن کی بھاپ سی مہک پھیلی جا رہی تھی۔ وہ دھیرے سے بولا، "لاؤ۔"

چندا نے کڑا اس کی طرف بڑھا دیا۔ کڑا ہاتھ میں لے کر اس نے کہا، "سنو!"

چندا نے سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھا دیں۔

اُن میں جھانکتے ہوئے بچن سنگھ نے اپنے ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے وہ کڑا اس کی کلائی میں پہنا دیا۔

چندا چپ چاپ کوٹھری کی طرف چل دی اور بچن سنگھ دواخانے کی طرف۔ اندھیرا ابری طرح بڑھ گیا تھا اور سامنے کھڑے پیڑ کی سیاہ پرچھائیں مزید گہری ہو گئی تھی۔ دونوں لوٹ گئے تھے لیکن جیسے اس اندھیرے میں کچھ رہ گیا تھا، چھوٹ گیا تھا۔ دواخانے کا لیمپ جو جلتے جلتے ایک بار بھڑک اٹھا تھا اُس میں تیل ختم ہو جانے کی وجہ سے بتی کی لو درمیان سے پھٹ گئی تھی، اُس کے اوپر دھوئیں کی لکیریں بل کھاتے سانپ کی طرح اندھیرے میں غائب ہو جاتی تھیں۔

صبح جب چندا جگپتی کے پاس پہنچی اور بستر ٹھیک کرنے لگی تو جگپتی کو لگا کہ چندا بہت اداس ہے۔ لمحہ بہ لمحہ چندا کے منہ پر اَن گنت جذبات آجا رہے تھے، جن میں پریشانی، اذیت اور اداسی تھی۔ کوئی غیر محسوس پاپ کرنے کے بعد دل کی گہرائی سے کی گئی توبہ کی دھندلی چمک!۔۔۔

"رانی وزیر کے ساتھ جب ناکام لوٹیں، تو دیکھا، راجا محل میں حاضر تھے، اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔" ماں سنایا کرتی تھیں، "لیکن راجا کو رانی کا اس طرح وزیر کے ساتھ جانا اچھا نہیں لگا۔ رانی نے راجا کو سمجھا دیا کہ وہ تو صرف راجا کے تئیں اٹوٹ پیار کی خاطر اپنے کو نہ روک سکی۔ راجا رانی ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ دونوں کے دلوں میں ایک بات کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی کہ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔۔۔ شاہی خاندان کی شمع گل ہونے کو تھی۔ اولاد کی کمی کے باعث ان کا لوک پرلوک بگڑتا جا رہا تھا اور خاندان کی عزت مٹی میں ملنے کا خدشہ بڑھتا جا رہا تھا۔"

دوسرے دن بجن سنگھ نے مریضوں کی مرہم پٹی کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اُس کا تبادلہ مین پوری کے صدر اسپتال میں ہو گیا ہے اور وہ پرسوں یہاں سے چلا جائے گا۔ جگپتی نے سنا، تو اسے بھلا ہی لگا۔۔۔ آئے دن بیماریاں گھیرے رہتی ہیں، بجن سنگھ اس کے شہر کے اسپتال میں پہنچا جا رہا ہے، تو کچھ مدد ملتی ہی رہے گی۔ آخر وہ ٹھیک تو ہو گا ہی اور پھر مین پوری کے سوا کہاں جائے گا؟ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کا دل ناقابلِ بیان بھاری پن سے بھر گیا۔ پتہ نہیں کیوں، چندا کے وجود کا خیال آتے ہی اُسے اس خبر میں کچھ ایسے نوکیلے کانٹے دکھائی دینے لگے، جو اس کے جسم میں کسی بھی وقت چبھ سکتے تھے، ذرا سا بے خبر ہونے پر گھس سکتے اور تب اس کے سامنے آدمی کے حق اور اس کے ادھیکار کی لکشمن ریکھائیں دھوئیں کی لکیر کی طرح کانپ کر مٹنے لگیں اور دل میں چھپے شک کے عفریت خانہ بدوش جوگی کی طرح آوارگی کرنے لگے۔

اور پندرہ بیس روز بعد جب جگپتی کی حالت سدھر گئی تو چندا اُسے لے کر گھر لوٹ آئی۔ جگپتی چلنے پھرنے لائق ہو گیا تھا۔ گھر کا تالا کھولا، تب رات جھک آئی تھی اور پھر ان کی گلی میں شام سے ہی اندھیرے کا راج شروع ہو جاتا تھا۔ پر گلی میں آتے ہی انھیں لگا، جیسے کہ

بن باس کاٹ کر راج دھانی لوٹے ہوں۔ نکڑ پر جمنا سنار کی کوٹھری میں سر ہی ٹپٹپی جا رہی تھی، جس کے دراز در دراز دروازوں سے لالٹین کی روشنی کی لکیریں جھانک رہی تھیں اور چپی تمباکو کا دھواں تنگ گلی کے دہانے پر بری طرح بھر گیا تھا۔ سامنے ہی منشی جی اپنی ڈھیلی کھٹیا کے گدّھے میں دیے کی مدھم روشنی میں کھاتہ کھتونی بچھائے میزان لگانے میں مشغول تھے۔ جب جگپتی کے گھر کا دروازہ کھڑکا تو اندھیرے میں اس کی چاچی نے اپنے جنگلے سے دیکھا اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے اپنے گھر کے اندر اعلان کر دیا کہ "راجا نر بنسیا اسپتال سے لوٹ آئے۔۔۔ سول ماں بھی آئی ہیں۔"

یہ الفاظ سنتے ہی گھر کے اندھیرے بر آمدے میں داخل ہوتے ہی جگپتی ہانپ کر بیٹھ گیا جھنجھلا کر چندا سے بولا، "اندھیرے میں کیا میرے ہاتھ پیر تڑواؤ گی؟ اندر جا کر لالٹین جلا لاؤ۔"

"تیل نہیں ہو گا اس وقت ذرا ایسے ہی کام۔۔۔"

"تمھارے کبھی کچھ نہیں ہو گا۔۔۔ نہ تیل۔۔۔" کہتے کہتے جگپتی ایک دم خاموش ہو گیا اور چندا کو لگا کہ آج پہلی بار جگپتی نے اس کے بانجھ پن پر اپنی گہری چوٹ کر دی جس کی گہرائی کا اس نے کبھی اندازہ نہیں کیا تھا۔ دونوں خاموش، بغیر کچھ بولے اندر چلے گئے۔

رات کے بڑھتے سناٹے میں دونوں کے سامنے دو باتیں تھیں۔۔۔

جگپتی کے کانوں میں جیسے کوئی طنز سے کہہ رہا تھا ـــــ راجا نر بنسیا اسپتال سے آ گئے!

اور چندا کے دل میں یہ بات چبھ رہی تھی ـــــ تمھارے کبھی کچھ نہیں ہو گا۔۔۔

اور سسکتی سسکتی چندا نہ جانے کب سو گئی۔ لیکن جگپتی کی آنکھوں میں نیند نہیں آئی۔ کھاٹ پر پڑے پڑے اس کی چاروں طرف خیالی مگر خوفناک جال پھیل گیا۔ لیٹے لیٹے اسے ایسا لگا جیسے اس کی اپنی ہستی کا خاکہ گھٹتے گھٹتے محض ایک نقطہ سا رہ گیا۔ لیکن اس نقطہ کے ہاتھ تھے پیر تھے اور دل کی دھڑکن بھی۔ کوٹھری کا گھٹا گھٹا سا اندھیارا سیل سے اٹی دیواریں اور مہیب غاروں کی سی الماریاں جن میں سے بار بار کوئی جھانک کر دیکھتا تھا۔۔۔ اور وہ لرز اٹھتا تھا۔۔۔ پھر گویا سب کچھ تبدیل ہو گیا ہو۔ اسے لگا کہ اس کی ہنسی کا خاکہ بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ

آدمی بن گیا، لمبا تڑنگا تندرست مرد بن گیا، اس کی شریانوں میں کچھ پھوٹ پڑنے کے لیے بے چینی سے کھول اٹھا۔ اس کے ہاتھ جسم کی نسبت سے بہت بڑے خوفناک اور قدرے بھیانک ہو گئے ان میں لمبے لمبے ناخن نکل آئے۔۔۔وہ راکشش بنا پھر آدم خور بن گیا۔۔۔ بالکل قدیم وحشی!

اور بڑی تیزی سے سارا کمرہ یکبارگی چکر کاٹ گیا۔ پھر رفتہ رفتہ سب کچھ غیر متحرک ہو تا گیا اور اس کی سانسیں معمول پر آنے لگیں پھر گویا بڑی کوشش کرنے پر گھگھی بندھ جانے کے بعد بمشکل اس کی آواز نکلی، "چندا!"

چندا کی نرم سانسوں کی ہلکی سرسراہٹ کمرے میں جان ڈالنے لگی۔ جگپتی اپنی کھاٹ کی پٹی کا سہارا لے کر جھکا۔ کانپتے پیر اس نے زمین پر رکھے اور چندا کے کھاٹ کے پائے سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ اُسے لگا، جیسے چندا کی ان سانسوں کی آواز میں زندگی کی موسیقی گونج رہی ہے۔ وہ اٹھا اور چندا کے چہرے پر جھک گیا۔۔۔ اُس اندھیرے میں کافی دیر آنکھیں جمائے رہا پھر بہت دیر بعد جیسے خود چندا کے چہرے سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر بکھرنے لگی۔۔۔ اس کے نقوش منور ہو گئے اور جگپتی کی آنکھوں کو بصیرت مل گئی، وہ بے خودی سے اسے تاکتا رہا۔

چندا کے بکھرے بالوں میں بالکل نوزائیدہ بچے کے پیدائشی بالوں کی سی مہک۔۔۔ دودھ کی کچی بو۔۔۔ جسم کے رس کی سی مٹھاس اور معصوم پیار کی چکناہٹ تھی اور پیشانی پر بالوں کے پاس تمام چھوٹے چھوٹے نرم نرم روئیں۔۔۔ ریشم سے۔۔۔ اور اُس پر کبھی لگائی گئی سیندور کی بندیا کا مٹا ہوا سا احساس۔۔۔ ننھی ننھی نازک پلکیں اور ان کے کانٹوں کی طرح باریک ملائم بال اور سانسوں میں ڈھل کر آتی ہوئی اُس روح کی پاکیزہ آواز کی لے۔۔۔ پھول کی پنکھڑی سے پتلے پتلے ہونٹ جن میں اچھوتی لکیریں تھیں اور صرف دودھ کی سی مہک!

اُس کی آنکھوں کے سامنے ممتا سی چھا گئی، صرف ممتا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا، 'بچی!'

ڈرتے ڈرتے اس کے بالوں کی ایک لٹ کو بڑے جتن سے اس نے ہتھیلی پر رکھا اور انگلی سے اس پر جیسے لکیریں کھینچنے لگا۔ اُسے لگا جیسے کوئی معصوم اس کی گود میں آنے کے

لیے چھپاکر مایوس ہو کر سو گیا ہے۔ اُس نے دونوں ہتھیلیوں کو پھیلا کر اُس کے سر کو اپنے حلقے میں لینا چاہا کہ کوئی سخت چیز اس کی انگلیوں سے ٹکرائی۔

وہ گویا ہوش میں آ گیا۔

بہت ہی آہستگی سے اس نے چندا کے سرہانے کے نیچے ٹٹولا۔ ایک رومال میں بندھا کچھ اُس کے ہاتھ میں آ گیا اپنے آپ کو قابو میں کرتے ہوئے وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا، اُسی اندھیرے میں اس رومال کو کھولا تو جیسے اسے سانپ سونگھ گیا، چندا کے ہاتھوں کے دونوں سونے کے کڑے اس میں لپٹے ہوئے تھے!

اور تب اس کے سامنے ساری کائنات دھیرے دھیرے پاش پاش ہو کر بکھرنے لگی۔ یہ کڑے تو چندا بیچ کر اس کا علاج کرا رہی تھی۔ وہ سب دوائیں اور طاقت کی ٹانک۔۔۔ اُس نے تو کہا تھا، یہ دوائیں کسی کی مہربانیاں نہیں ہیں، میں نے ہاتھ کے کڑے بیچنے کو دیے تھے۔۔۔ لیکن اس کا گلا بری طرح خشک ہو گیا۔ زبان جیسے تالو سے چپک کر رہ گئی اس نے چاہا کہ چندا کو جھنجھوڑ کر اسے اٹھائے، لیکن جسم کی ساری قوت بہہ سی گئی تھی، خون پانی ہو گیا تھا۔

اپنے آپ پر قابو پانے کے بعد اس نے وہ کڑے اُسی رومال میں لپیٹ کر اس کی کھاٹ کے کونے پر رکھ دیے اور بڑی مشکل سے اپنی کھاٹ کی پٹی پکڑ کر لڑھک گیا۔

'چندا جھوٹ بولی! لیکن کیوں؟ کڑے آج تک چھپائے رہی۔ اس نے اس قدر رازداری کیوں برتی؟ آخر کیوں؟ کس لیے؟' اور جگپتی کا دل بھاری ہو گیا۔ اُسے پھر لگا کہ اس کا جسم سمٹ رہا ہے اور وہ ٹہنیوں سے بنا ڈھانچہ رہ گیا۔۔۔ بے حد ہلکا، تنکے جیسا، ہوا میں اڑ کر بھٹکنے والے تنکے جیسا۔

اُس رات کے بعد جگپتی روزانہ ہی سوچتا رہا کہ چندا سے کڑے مانگ کر بیچ دے اور کوئی چھوٹا موٹا کاروبار ہی شروع کر دے، کیونکہ نوکری چھوٹ چکی تھی۔ اتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد وکیل صاحب نے دوسرا محرر رکھ لیا تھا۔ وہ روز یہی سوچتا لیکن جب چندا سامنے آتی تو نہ جانے کیسے بے یار و مددگار سی اُس کی حالت ہو جاتی۔ اُسے لگتا، جیسے کڑے مانگ کر وہ چندا سے بیوی کا درجہ بھی چھین لے گا۔ ماں کا درجہ تو بھگوان نے چھین ہی لیا۔۔۔ وہ سوچتا آخر چندا کیا رہ جائے گی؟ ایک عورت سے اگر بیوی اور ماں کا درجہ چھین لیا جائے تو اس کی زندگی کے کیا معنی رہ جائیں گے؟ چندا کے ساتھ وہ یہ بے انصافی کیسے کرے؟ اُس

سے دوسری آنکھ کی روشنی کیسے مانگ لے؟ پھر تو وہ بالکل اندھی ہو کر رہ جائے گی اور ان کڑوں کے مانگنے سے جس خفیہ تاریخ کی روح عریاں ہو جائے گی، کیسے وہ اُس لاج کو خود ہی کھول کر ڈھانپے گا؟

اور وہ ان ہی خیالوں میں ڈوبا، صبح سے شام تک تلاش معاش میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہتا۔ کسی سے اُدھار لے لے؟ لیکن کس برتے پر؟ کیا ہے اس کے پاس، جس کی بنا پر کوئی اسے کچھ دے گا؟ اور محلے کے لوگ۔۔۔ جو ایک ایک پائی پر جان دیتے ہیں، کوئی چیز خریدتے وقت دام میں ایک پائی کا فرق ہونے پر میلوں پیدل جا کر ایک پیسہ بچاتے ہیں۔ ایک ایک پیسے کی مسالے کی پڑیا بندھوا کر گیارہ مرتبہ پیسوں کا حساب جوڑ کر ایک آدھ پیسہ اُدھار رکھکر منتیں کرتے سودا گھر لاتے ہیں۔ گلی میں خوانچے والا پھنس گیا تو دو پیسے کی چیز کو لڑ جھگڑ کر، چار دانے زیادہ پانے کی نیت سے، دو جگہ بندھواتے ہیں۔ بھاؤ کے ذرا سے فرق پر گھنٹہ بھر بحث کرتے ہیں، کفایت کی خاطر شام کی گلی سڑی ترکاریاں لاتے ہیں، ایسے لوگوں سے وہ کس منہ سے مانگ کر، وہ اُن کے غریبی کے احساس پر ٹھوکر مارے!

لیکن اس دن شام کو جب وہ گھر پہنچا تو سامنے ہی ایک سائیکل رکھی نظر آئی۔ دماغ پر بہت زور ڈالنے کے بعد بھی کہ آنے والا کون ہے یہ اندازہ نہ کر سکا۔ اندر کے دروازے پر جب پہنچا تو، تو اچانک ہنسی کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ اُس ہنسی میں ایک عجیب سی خوشی تھی اور پھر چندا کی آواز آئی ـــــ

"اب آتے ہی ہوں گے، بیٹھیے نا دو منٹ اور!۔۔۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے اور انھیں سمجھاتے جایئے کہ ابھی تندرستی اس لائق نہیں کہ دِن دن بھر گھومنا برداشت کر سکیں۔۔۔"

"ہاں بھئی، کمزوری اتنی جلدی نہیں مٹ سکتی، خیال نہیں رکھیں گے تو نقصان اٹھائیں گے!" یہ کوئی مردانہ آواز تھی۔

جگپتی پریشانی میں پڑ گیا۔ کیا وہ ایک دم سے اندر داخل ہو جائے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ لیکن جب اُس نے قدم اٹھائے تو وہ باہر جا رہے تھے۔ باہر سائیکل پر ہاتھ پڑتے ہی اُس کے حواس بجا ہوئے، وہیں سے گویا انجان بنتے ہوئے بمشکل آواز کھولتے ہوئے وہ چلایا، "ارے چندا، یہ سائیکل کس کی ہے؟ کون مہربان۔۔۔"

چندا اُس کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکل آئی گویا خوشخبری سنا رہی تھی، ''اپنے کمپاؤنڈر صاحب آئے ہیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آج گھر کا پتہ مل سکا ہے۔ تمھارے انتظار میں بیٹھے ہیں؟''

''کون بچن سنگھ؟۔۔۔اچھا۔۔۔اچھا۔ وہی تو میں سوچ رہا تھا، بھلا کون۔۔۔'' کہتا جگپتی پاس پہنچا اور باتوں میں اس طرح الجھ گیا جیسے سارے حالات کو اس نے قبول کر لیا ہو۔

بچن سنگھ جب پھر آنے کی بات کہہ کر چلا گیا، تو چندا نے بہت اپنے پن سے جگپتی کے سامنے بات شروع کی، ''جانے کیسے کیسے آدمی ہوتے ہیں۔۔۔''

''کیوں کیا ہوا؟ کیسے ہوتے ہیں آدمی؟'' جگپتی نے پوچھا۔

''اتنی چھوٹی جان پہچان میں تم، مردوں کے گھر میں نہ رہتے، گھس کر بیٹھ سکتے ہو؟ تم تو الٹے پیروں لوٹ جاؤ گے،'' یہ کہہ کر چندا جگپتی کے چہرے پر خاطر خواہ رد عمل دیکھنے کے لیے گہری نگاہوں سے تاکنے لگی۔

جگپتی نے چندا کی طرف ایسے دیکھا جیسے یہ بات بھی کہنے پوچھنے کی ہے! پھر بولا، ''بچن سنگھ اپنی طرح کا آدمی ہے، اپنی طرح کا اکیلا۔۔۔''

''ہوگا۔۔۔پر۔۔۔'' کہتے کہتے چندا رک گئی۔

''آڑے وقت کام آنے والا آدمی ہے، لیکن اُس سے فائدہ اٹھا سکنا جتنا آسان ہے۔۔۔اتنا۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔ جس سے کچھ لیا جائے گا، اُسے دیا بھی تو جائے گا،'' جگپتی نے آنکھیں دیوار پر گڑاتے ہوئے کہا۔

اور چندا اٹھ کر چلی گئی۔

اس دن کے بعد بچن سنگھ لگ بھگ روز ہی آنے لگا، جگپتی اس کے ساتھ ادھر اُدھر گھومتا بھی رہتا، عجیب سی گھٹن اس کے دل کو جکڑ لیتی اور زندگی کے تمام تضادات اس کی نگاہوں کے سامنے آجاتے۔ آخر وہ خود بھی ایک آدمی ہے۔۔۔بے کار۔۔۔ یہ مانا کہ اس کے سامنے پیٹ پالنے کا ایسا کوئی سنجیدہ مسئلہ نہیں، وہ بھوکوں نہیں مر رہا ہے، جاڑے میں کانپ نہیں رہا ہے، لیکن اس کے دو ہاتھ پیر ہیں، جسم کا ڈھانچہ ہے جو کچھ مانگتا ہے۔۔۔ کچھ! اور وہ سوچتا، یہ کچھ کیا ہے؟ سکھ؟ شاید ہاں، شاید نہیں۔ وہ تو دکھ میں بھی جی سکنے کا عادی ہے،

گندگی میں زندگی بتادینے والا حیر تناک کیڑا ہے۔ تو پھر ہوس؟ شاید ہاں، شاید نہیں۔ چندا کا جسم پاکر اس نے لمحاتی تلذذ بھی حاصل کیا تھا تو پھر دھن دولت ـ ـ ـ شاید ہاں، شاید نہیں۔ اس نے دھن کے لیے اپنے کو کھپایا ہے لیکن وہ بھی اس نظر نہ آنے والی پیاس کو بجھا نہیں سکا، تو پھر؟ ـ ـ ـ تو پھر کیا؟ وہ کچھ کیا ہے، جو اُس کی روح میں ناسور کی طرح رِستا رہتا ہے، اپنی نیکی کا بدلہ مانگتا ہے؟ شاید کام؟ شاید کام! ہاں، یہی بالکل یہی جو اس کی زندگی کی گھڑیوں کو بالکل سونا نہ چھوڑے، جس میں وہ اپنی قوت لگا سکے، اپنا دل لگا سکے، اپنے کو کامیاب محسوس کر سکے، چاہے اُس میں سکھ یا دکھ، خطرات ہوں یا سلامتی، آسودگی ہو یا نا آسودگی ـ ـ ـ اسے صرف کام چاہیے! کرنے کے لیے کچھ چاہیے یہ تو اس کی فطری ضرورت ہے، پہلی اور آخر مانگ ہے، کیونکہ وہ اُس گھر میں نہیں پیدا ہوا۔ جہاں صرف زبان کی حرکت سے حکم چلانے والے ہوتے ہیں۔ وہ اس گھر سے تعلق رکھتا ہے جو صرف کام کرنا جانتا ہے، کام ہی جس کی آس ہے۔ وہ صرف کام چاہتا ہے کام! ـ ـ ـ

اور ایک دن اُس کے کام دھام کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ تالاب والے اونچے میدان کے جنوب میں جلپتی کی لکڑی کی ٹال کھل گئی۔ تک تنگ گیا۔ ٹال کی زمین پر لکشمی پوجا بھی ہو گئی اور ہون بھی ہو گیا۔ لکڑی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ گاؤں سے آنے والی گاڑیوں کو، اس کاروبار کے مانے ہوئے آدمیوں کی مدد سے مول تول کروا کے وہاں گروا دیا گیا۔ گانٹھیں ایک طرف رکھ دی گئیں۔ چیلوں کا چٹا قرینے سے لگ گیا۔ اور کندے چیرنے کے لیے ڈال دیے گئے۔ دو تین گاڑیوں کا سودا کر کے ٹال چالو کر دی گئی۔ مستقبل میں خود پیڑ خرید کر کٹانے کا طے کیا گیا۔ بڑی بڑی اسکیمیں بنیں کہ کس طرح جلانے کی لکڑی کی کوٹھی بنے گی۔ چیرنے کی نئی مشینیں لگیں گی۔ کاروبار بڑھ جانے پر بچن سنگھ بھی نوکری چھوڑ کر اُسی میں لگ جائے گا۔ اور اُس نے محسوس کیا کہ وہ کام میں لگ گیا ہے۔ اب چوبیس گھنٹے اس کے سامنے کام ہے۔ اُس کا وقت کار آمد ہو گیا ہے۔ دن بھر میں وہ ایک گھنٹے کے لیے کسی کا دوست ہو سکتا ہے، کچھ دیر کے لیے وہ شوہر ہو سکتا ہے لیکن باقی وقت؟ دن اور رات کے باقی گھنٹے ـ ـ ـ اُن گھنٹوں کے خلا کو اُس کا اپنا کام ہی بھر سکتا ہے ـ ـ ـ اور اب وہ کام والا ہو گیا تھا ـ ـ ـ

اب اس کے پاس کام تو تھا، لیکن جب ٹال کی اس زمین پر بڑے چھپر کے نیچے تخت پر وہ گلّہ رکھ کر بیٹھتا، سامنے لکڑیوں کے ڈھیر، کٹے ہوئے پیڑ کے تنے، جڑوں کو لڑھکا ہوا

دیکھتا، تو ایک اداسی یک بہ یک اس کے دل کو باندھنے لگتی۔ اسے لگتا کہ ایک بے جوت جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے سامنے ڈال دیا گیا ہے۔۔۔ پھر ان پر اور کلہاڑی چلے گی۔ اور ان کے ریشے ریشے الگ ہو جائیں گے اور پھر انھیں تک پر تول کر کسی پیشے والے کے ہاتھ بیچ دیا جائے گا۔

اور تب اس کی نگاہیں سامنے کھڑے تاڑ پر اٹک جاتیں، جس کے بڑے پتوں پر سرخ گردن والے گدھ پنکھ پھڑپھڑا کر دیر تک خاموش بیٹھے رہتے۔ تاڑ کا کالا گزرے دار تنا۔۔۔ اور اس کے سامنے ٹھہری ہوئی ہوا میں بے سہارا بے وزن نیم کی پتیاں چکراتی جھڑتی رہتیں۔۔۔ دھول بھری دھرتی پر لکڑی کی گاڑیوں کے پہیوں کی پڑی ہوئی لکیر دھندلی سی چمک اٹھتی اور بغل والے مونگ پھلی کے بیج کی یکساں طور پر کھرکھراتی آواز کانوں میں بھرنے لگتی۔ بغل والی کچی پگڈنڈی سے کوئی گزر کر ٹیلے کے ڈھلان سے تالاب کی گہرائی میں اتر جاتا جس کے گدلے پانی میں کوڑا تیر تا رہتا اور سور کیچڑ میں منہ ڈال کر اس کوڑے کو روندتے رہتے۔۔۔

دو پہر گمٹی اور شام کی دھند چھا جانے لگتی، تو وہ لالٹین جلا کر چھپر کے کھمبے کی کیل میں ٹانگ دیتا اور کچھ دیر بعد اسپتال والی سڑک سے بچن سنگھ ایک کالے دھبے کی طرح آتا دکھائی دیتا۔

گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے میں اس کا خاکہ دھیرے دھیرے بڑھتا جاتا اور جگپتی کے سامنے جب وہ آکر کھڑا ہوتا، تو وہ اسے بہت لحیم شحیم سا لگنے لگتا جس کے سامنے اسے اپنا وجود ڈوبتا محسوس ہوتا۔

ایک آدھ بات بکری کی ہوتی اور پھر دونوں گھر کی طرف چل دیتے۔ گھر پہنچ کر بچن سنگھ کچھ دیر ضرور رکتا، بیٹھتا ادھر ادھر کی باتیں کرتا، کبھی کبھی جگپتی اور بچن سنگھ کی تھالی ساتھ ہی لگ جاتی۔ چندا سامنے بیٹھ کر دونوں کو کھلاتی۔

بچن سنگھ بولتا جاتا، "کیا ترکاری بنی ہے! مسالہ ایسا پڑا ہے کہ اس کی بھی بہار ہے اور ترکاری کا مزہ بھی نہیں مرا۔ ہوٹلوں میں یا تو مسالہ ہی مسالہ رہے گا یا صرف ترکاری ہی ترکاری! واہ! واہ! کیا بات ہے اندازے کی!"

اور چندا بیچ بیچ میں ٹوک کر بولتی جاتی، "ہم نہیں تو جب تک دال میں پیاز کا بھنا گھی

نہ ملے، تب تک پیٹ ہی نہیں بھرتا۔"

یا ــــ "سرکہ اگر انھیں مل جائے، تو سمجھو، سب کچھ مل گیا۔ پہلے مجھے سرکہ نہ جانے کیسا لگتا تھا، پر اب ایسا زبان پر چڑھا ہے کہ ۔۔۔"

یا ــــ "انھیں کاغذ سی پتلی روٹی پسند ہی نہیں آتی۔ اب مجھ سے کوئی پتلی روٹی بنانے کو کہے، تو بنتی ہی نہیں، عادت پڑ گئی ہے اور پھر جی بھی نہیں چاہتا۔۔۔"

لیکن چندا کی آنکھیں بچن سنگھ کی تھالی پر ہی جمی رہتیں، روٹی ختم ہوئی تو روٹی پروس دی۔ دال ختم نہیں ہوئی تو بھی ایک چمچہ اور پروس دی۔

اور جگپتی سر جھکائے کھاتا رہتا۔ صرف ایک گلاس پانی مانگتا اور چندا چونک کر پانی دینے سے پہلے کہتی، "ارے تم نے تو کچھ لیا بھی نہیں!" کہتے کہتے وہ پانی دے دیتی اور تب اس کے دل پر گہری سی چوٹ لگتی، نہ جانے کیوں وہ خاموشی کی چوٹ اسے بڑی اذیت دے جاتی۔۔۔ لیکن وہ اپنے آپ کو سمجھا لیتی کوئی مہمان تو نہیں ہیں۔۔۔ مانگ سکتے تھے۔ بھوک نہیں ہو گی۔

جگپتی کھانا کھا کر ٹال پر لیٹنے چلا جاتا، کیونکہ ابھی تک کوئی چوکیدار نہیں ملا تھا۔ چھپر کے نیچے تخت پر جب وہ لیٹتا تو اچانک ہی اس کا دل بھر آتا۔ پتہ نہیں، کون کون سے درد ایک دوسرے سے مل کر طرح طرح کی ٹیس، چیخ اور اینٹھن پیدا کرنے لگتے۔ کوئی ایک رگ دکھتی تو وہ سہلا بھی لیتا، جب سبھی نسیں چٹخنی ہوں تو کہاں کہاں راحت کا اکیلا ہاتھ سہلائے!

لیٹے لیٹے اس کی نگاہ تاڑ کی اس جانب بنی پختہ قبر پر جم جاتی جس کے سرہانے خاردار ببول کا تنہا پیڑ گم صم کھڑا رہتا۔ اس قبر پر ایک پردہ نشین عورت بڑے لحاظ سے آکر سویرے سویرے بیلا اور چنبیلی کے پھول چڑھا جاتی۔۔۔ اس کا طواف کرتی اور سر پٹک کر پھر کچھ قدم اداس اداس سی چل کر ایک دم تیزی سے مڑ کر بساطیوں کے محلے میں کھو جاتی۔ شام ہوتے پھر آتی۔ ایک شمع اور کچھ اگربتیاں جلاتی، پھر مڑتے ہوئے اوڑھنی کا پلہ کندھے پر ڈالتی تو شمع کی لو کانپتی، کبھی کانپ کر بجھ جاتی، لیکن اس کے قدم بڑھ چکے ہوتے، پہلے دھیمے تھکے اداس سے اور پھر نپے تلے اور یکساں طور پر پڑتے اور پھر وہ اسی محلے میں کھو جاتی اور تب رات کی تنہائی میں۔۔۔ ببول کے کانٹوں کے بیچ اس سائیں سائیں کرتے اونچے نیچے میدان میں جیسے

اُس قبر سے کوئی روح نکل کر بالکل اکیلی بھٹکتی رہتی۔۔۔

پھر تاڑ پر بیٹھے سرخ گردن والے گدھ منحوس سی آواز میں کلبلا اٹھتے اور تاڑ کے پتے دہشت ناک طور پر کھڑ کھڑا اٹھتے، جگپتی کا بدن کانپ جاتا اور وہ بھٹکتی روح زندہ رہ سکنے کے لیے جیسے قبر کی اینٹوں میں، ببول کے سائے تلے دبک جاتی۔ جگپتی اپنی ٹانگوں کو پیٹ سے بھینچ کر، کمبل سے منہ چھپا اوندھا لیٹ جاتا۔

تڑکے ہی ٹھیلے پر لگے لکڑ بارے لکڑی چیرنے آجاتے۔ تب جگپتی کمبل لپیٹ کر گھر کی جانب چلا جاتا۔۔۔

"راجا روز ٹہلنے جاتے تھے،" ماں سنایا کرتی تھیں، "ایک دن جیسے ہی محل کے باہر نکل کر آئے کہ سڑک پر جھاڑو لگانے والی مہترانی انھیں دیکھتے ہی اپنی جھاڑو کا پنجہ پٹک کر ماتھا پیٹنے لگی اور کہنے لگی، ہائے رام! آج راجا نربنسیا کا منہ دیکھا ہے، نہ جانے روٹی بھی نصیب ہو گی کہ نہیں۔۔۔ نہ جانے کون سی آفت ٹوٹ پڑے! راجا کو اتنا دکھ ہوا کہ الٹے پیروں محل کو لوٹ گئے۔ وزیر کو حکم دیا کہ اس مہترانی کا گھر اناج سے بھر دیں۔ اور سب شاہی لباس اتار کر اُسی لمحے راجا جنگل کی طرف چل پڑے اُسی رات رانی نے خواب دیکھا کہ کل رات اُن کی دلی تمنا پوری ہو گی۔ رانی بہت پچھتا رہی تھی، لیکن فوراً ہی رانی راجا کو ڈھونڈتی اس سرائے میں پہنچ گئی جہاں ان کا قیام تھا۔ رانی کنیز کا بھیس بدل کر رات کو راجا کے پاس پہنچی۔ رات بھر اُن کے ساتھ رہی اور صبح راجا کے بیدار ہونے سے پہلے سرائے کو خیر باد کہہ کر محل میں لوٹ آئی۔ راجا صبح اٹھ کر دوسرے دیش کی طرف نکل گئے۔ دو ہی دنوں میں راجا کے چلے جانے کی خبر ساری سلطنت میں پھیل گئی، راجا چلے گئے چاروں طرف یہی خبر تھی۔۔۔"

اور اُسی دن ٹولے محلے کے ہر آنگن میں برسات کے مہینے کی طرح یہ خبر برس کر پھیل گئی کہ چندا کے بال بچہ ہونے والا ہے۔

نکڑ پر جمنا سنار کی کوٹھری میں پھنکتی سُر ہی رک گئی۔ منشی جی نے اپنا میزان لگانا چھوڑ کر متحیر نظروں سے تاک کر خبر سنی۔ جنسی کرانے والے نے کنویں میں سے آدھی گئی رسی کھینچ کر ڈول منڈیر پر پٹک کر سنا۔ سدر شن درزی نے مشین کے پہیے کو ہتھیلی سے رگڑ کے روک کر سنا۔ ہنس راج پنجابی نے اپنی نیل لگی ململی قمیض کی آستینیں چڑھاتے ہوئے

سنا۔۔۔ اور جگپتی کی بیوہ چاچی نے عورتوں کے جمگھٹے میں پُر وثوق مگر رازدارانہ انداز میں سنایا ـــــ "آج چھ سال ہو گئے شادی کو۔۔۔ نہ بال، نہ بچہ۔۔۔ نہ جانے کس کا پاپ ہے اُس کے پیٹ میں۔۔۔ اور کس کا ہو گا سوائے اس مسٹنڈے کمپوٹر کے! نہ جانے کہاں سے کلنکنی اس محلے میں آ گئی!۔۔۔ اس گلی کی تو پشتوں سے ایسی مریادا رہی ہے کہ غیر مرد عورت کی پرچھائیں تک نہیں دیکھ پائے، یہاں کے مرد تو بس اپنی گھر کی عورتوں کو جانتے ہیں، انھیں تو پڑوسی کے گھر کی زنانیوں کی گنتی تک نہیں معلوم!" یہ کہتے کہتے ان کا چہرہ تمتما جاتا۔ اور سب عورتیں دیولوک کی دیویوں کی طرح سنجیدہ بنی اپنے تقدس کی عظمت کے بوجھ سے دبی دھیرے دھیرے کھسک گئیں۔

صبح یہ خبر پھیلنے سے پہلے جگپتی نال پر چلا گیا تھا۔ لیکن سنی اُس نے بھی آج ہی تھی۔ دن بھر وہ تخت پر کونے کی طرف منہ کیے پڑا رہا۔ نہ ٹھیکے کی لکڑیاں چروائیں نہ بکری کی جانب دھیان دیا، نہ دوپہر کا کھانا کھانے گھر گیا۔ جب رات کی چادر اچھی طرح بن گئی تو وہ ایک درندے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا، اس نے اپنی انگلیاں چٹخائیں، مٹھی باندھ کر قوتِ بازو کو پرکھا تو نسیں تن گئیں اور بانہہ بری طرح تھر تھرا گئی۔ اس نے تین بار لمبی لمبی سانسیں کھینچیں اور مضبوط قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ میدان ختم ہوا۔۔۔ کنکر کی سڑک آئی۔۔۔ سڑک ختم ہوئی، گلی آئی۔ لیکن گلی کے اندھیرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ سہم گیا، جیسے کسی نے نظر نہ آنے والے ہاتھوں سے اسے دبوچ کر سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ اُس کی اُمنڈ آئی قوت کی نس پر برف سے ٹھنڈے ہونٹ رکھ کر سارا رس چوس لیا ہو اور گلی کے اندھیرے کی حقارت بھری کالک اور بھی بھاری ہو گئی جس میں داخل ہونے سے اس کی سانس رک جائے گی۔۔۔ دم گھٹ جائے گا۔

وہ پیچھے مڑا لیکن رک گیا، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے وہ چوروں کی طرح بے آواز قدموں سے کسی طرح گھر کے اندر پہنچ گیا۔

دائیں طرف باورچی خانے کی دہلیز پر کپّی ٹمٹما رہی تھی اور چندا شاید آسمان تکتے تکتے دیوار سے سر ٹیکے بے ترتیب سو گئی تھی۔ کپّی کی روشنی اس کے آدھے چہرے کو اُجاگر کیے ہوئے تھی اور آدھا چہرہ گھپ اندھیرے میں تھا اور نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ خاموشی سے کھڑا تاکتا رہا۔ چندا کے چہرے پر عورت پن کی بلوغت آج اسے

دکھائی دی۔ چہرے کی ساری معصومیت نہ جانے کہاں کھو گئی تھی، اس کا اچھوتا پن نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ بھولا بھولا چہرہ، جیسے ٹہنی سے توڑے پھول کو پانی میں ڈال کر تازہ کیا گیا ہو۔ جس کی پنکھڑیوں میں ٹوٹنے کی وجہ سے سُرمئی لکیریں پڑ گئی ہوں، لیکن بھیگنے سے بھاری پن آ گیا ہو۔

اُس کے کھلے پیر پر اُس کی نگاہ پڑی تو سوچا سا لگا۔ ایڑیاں بھری، سوجی سی اور ناخنوں کے پاس عجیب سا سوکھا پن۔ جگپتی کا دل ایک بار مسوس کر رہ گیا۔ اس نے چاہا کہ بڑھ کر اسے اٹھا لے اپنے ہاتھوں سے اس کا سارا جسم چھو چھو کر ساری آلودگی پوچھ دے، اُسے اپنی سانسوں کی آگ میں تپا کر ایک بار پھر پاکیزہ بنا دے، اور اُس کی آنکھوں کی گہرائی میں جھانک کر کہے کہ جنت سے کس جرم کی پاداش میں تمھیں یہاں پھینکا گیا ہے، چندا؟ یہ جرم تو امٹ تھا۔

تبھی چندا نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ جگپتی کو سامنے دیکھ کر اُسے لگا کہ وہ ایک دم ننگی ہو گئی ہو۔ بے حد شرمسار ہو کر اُس نے اپنے پیر سمیٹ لیے۔ گھٹنوں سے دھوتی نیچے سرکائی اور بڑی احتیاط سے اٹھ کر باورچی خانے کے اندھیرے میں کھو گئی۔

جگپتی حواس باختہ سا ہو کر وہیں کمرے کی دہلیز پر سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ نظر کمرے میں گئی تو لگا کئی انجانی آوازیں وہاں گونج رہی ہیں جن میں چندا کی آواز بھی شامل ہے، ہر طرف، گھر کے ہر کونے سے، اندھیرا سیلاب کی طرح بڑھتا آ رہا تھا۔۔۔ ایک عجیب خاموشی۔۔۔ حیرانی! رفتار تو ہے لیکن راستہ نہیں! چہرے ہیں لیکن بے شکل۔

"کھانا کھا لیتے،" چندا کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ وہ انجان سا ایسے اٹھ بیٹھا جیسے تیار بیٹھا ہو۔ اُس کی بات آج تک اس نے نہیں ٹالی تھی۔ کھانے تو بیٹھ گیا لیکن حلق سے کچھ نہیں اتر رہا تھا، تب چندا نے بالکل سپاٹ الفاظ میں کہا، "کل میں گاؤں جا رہی ہوں۔"

جیسے اس خبر کی اطلاع اُسے پہلے سے تھی، بولا، "اچھا۔"

چندا نے پھر کہا، "میں نے بہت پہلے گھر چٹھی ڈال دی تھی۔۔۔ بھیا کل لینے آ رہے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے،" جگپتی نے کھوئے کھوئے جواب دیا۔

چندا کا باندھ ٹوٹ چکا تھا، وہ وہیں گھٹنے میں منہ دبائے سسکیاں بھرنے لگی۔ نہ اٹھ

سکی نہ ہل سکی۔

جگپتی لمحے بھر کے لیے بے چین ہو گیا لیکن جیسے جم جانے کے لیے اس کے ہونٹ پھڑکے اور غصّے کے آتش فشاں کو جبر اً دباتے ہوئے بھی وہ پھوٹ پڑا، "یہ سب مجھے کیا دکھا رہی ہے؟ بے شرم! بے غیرت!۔۔۔ اُس وقت نہیں سوچا تھا، جب۔۔۔ میری لاش تلے۔۔۔"

"تب۔۔۔ کی بات جھوٹ ہے۔۔۔" سسکیوں کے بیچ چندا کی آواز نکلی، "لیکن جب تم نے مجھے بیچ دیا۔۔۔"

ایک بھرپور ہاتھ چندا کی کنپٹی پر آگ سلگاتا پڑا اور جگپتی اپنی ہتھیلی دوسری سے دباتا ہوا کھانا چھوڑ کر دوسری کوٹھری میں چلا گیا اور رات بھر کنڈی چڑھائے اُسی کالک میں گھُٹتا رہا۔

دوسرے دن چندا گھر چھوڑ کر اپنے گاؤں چلی گئی۔

جگپتی پورا دن اور رات ٹال پر ہی کاٹ دیتا، اُسی ویرانے میں تالاب کے بغل، قبر، ببول اور تاڑ کے پاس۔ لیکن دل مردہ ہو گیا تھا۔ زبردستی وہ اپنے کو وہیں روکے رہتا۔۔۔ اُس کا دل کرتا کہیں چلا جائے۔ لیکن کمزوری نے کچھ اس طرح اس کے تن من کو کھوکھلا کر دیا تھا کہ چاہتے ہوئے بھی وہ کہیں جا نہیں پاتا تھا۔ حقارت بھری نظریں سہتا، پر وہیں پڑا رہتا۔ کافی دنوں بعد جب نہیں رہا گیا تو ایک دن جگپتی گھر کو تالا لگا کر نزدیک کے گاؤں میں لکڑی کٹانے چلا گیا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ وہ معذور ہو گیا ہے بالکل لنگڑا، ایک رینگتا کیڑا۔ جس کے آنکھ ہے نہ کان، نہ دل ہے نہ احساس۔

وہ اُس باغ میں چلا گیا جہاں خریدے ہوئے پیڑ کٹنے تھے۔ دو آرے والوں نے پتلے پیڑ کے تنے پر آرار کھا۔ اور کرر کرر کا شور شروع ہو گیا۔ دوسرے پیڑ پر بنئے اور شکورے کی کلہاڑیاں بجنے لگیں اور گاؤں سے دور اُس باغ میں ایک لے سے بھرپور شور جاری رہا۔ جڑ پر کلہاڑی پڑتی تو پورا پیڑ تھرتھرا جاتا۔

قریب کے کھیت کی میڑھ پر بیٹھے جگپتی کا بدن بھی گویا کانپ کانپ اٹھتا۔ چندا نے کہا تھا، "لیکن جب تم نے مجھے بیچ دیا۔۔۔" کیا وہ ٹھیک کہتی تھی! کیا بچن سنگھ نے ٹال کے لیے جو

روپے دیے تھے، اس کا سود اُدھر سے چکایا جاتا تھا؟ کیا صرف وہی روپے آگ بن گئے، جس کی آنچ میں اُس کی خودداری، اعتماد اور اصول موم کی طرح پگھل گئے؟

"ش۔۔۔ کورے!" باغ سے لگے پیڑ پر سے کسی نے آواز لگائی، شکورے نے کلہاڑی روک کر وہیں سے ہانک لگائی۔ "کونے کے کھیت سے لیک بنی ہے، ذرا میٹر مار کر لنگھا لا گاڑی۔"

جگپتی کے خیالات بکھر گئے۔ اُس نے مڑ کر دیکھا تو بھینسا گاڑیاں لکڑی بھرنے کے لیے آ پہنچی تھیں۔ شکورے نے جگپتی کے پاس آکر کہا، "ایک گاڑی تو بھر دی گئی بلکہ ڈیڑھ گاڑی۔۔۔ اب اس پتوں والے پیڑ کو ہی چھانٹ دیں؟"

جگپتی نے اس پیڑ کی طرف دیکھا، جسے کاٹنے کے لیے شکورے نے اشارہ کیا تھا، پیڑ کی شاخیں ہری پتیوں سے بھری تھیں۔ وہ بولا، "ارے! یہ تو ہرا ہے ابھی اسے چھوڑ دو۔"

"ہرا ہونے سے کیا ہوتا ہے اکھڑ تو گیا ہے، نہ پھول کا نہ پھل کا۔ اب کون سے اس میں پھل پھول آئیں گے۔" شکورے نے پیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے استادی انداز سے کہا۔

"جیسا ٹھیک سمجھو تم،" جگپتی نے کہا اور اٹھ کر پکے کنویں پر پانی پینے چلا گیا۔

دوپہر ڈھلتے گاڑیاں بھر کر تیار ہوئیں اور شہر کی طرف روانہ ہو گئیں۔ جگپتی کو ان کے ساتھ آنا پڑا۔ گاڑیاں لکڑی سے لدی شہر کی جانب رواں دواں تھیں۔ اور جگپتی گردن جھکائے کچی سڑک کی دھول میں ڈوبا بھاری قدموں سے دھیرے دھیرے اُنھیں کی بجتی گھنٹیوں کے ساتھ بے جان سا بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔

"کئی برس بعد راجا پردیس سے بہت سا دھن کما کر گاڑی میں لاد کر اپنے وطن میں لوٹ آئے،" ماں سنایا کرتی تھیں، "راجا کی گاڑی کا پہیہ محل سے کچھ دور پتیل کی جھاڑی میں الجھ گیا۔ ہر ممکن کوشش کی لیکن پہیہ نہ نکلا۔ تب ایک پنڈت نے بتایا کہ "سکٹ" کے دن پیدا ہونے والا بچہ اگر اپنے گھر کی سپاری لا کر اس میں چھوا دے تو پہیہ نکل جائے گا۔ وہیں دو بچے کھیل رہے تھے، انھوں نے یہ سنا تو کود کر پہنچے اور کہا کہ ہماری پیدائش سکٹ کی ہے لیکن اگر تم

آدھی دولت دینے کا وعدہ کرو تو سپاری لا ئیں گے۔ راجا نے بات مان لی۔ بچے دوڑے دوڑے گھر گئے، سپاری لا کر چھوادی پھر گھر کا راستہ بتاتے بتاتے آگے چلے۔ آخر محل کے سامنے انھوں نے گاڑی روک لی۔

”راجا کو بڑا تعجب ہوا کہ ہمارے ہی محل میں یہ بچے کہاں سے آگئے؟ اندر پہنچے تو رانی خوشی سے بے حال ہو گئیں۔

لیکن راجا نے پہلے ان بچوں کے بارے میں پوچھا، تو رانی نے کہا کہ وہ دونوں بچے اُنھیں کے راجکمار ہیں۔ راجا کو یقین نہ آیا، رانی بہت دکھی ہوئیں۔“

گاڑیاں جب ٹال پر آکر لگیں اور جگپتی تخت پر ہاتھ پیر ڈھیلے کر کے بیٹھ گیا، تو پگڈنڈی سے گزرتے منشی جی نے اُس کے پاس آکر بتایا، ”ابھی اُس دن وصولی میں تمھاری سسرال کے نزدیک ایک گاؤں میں جانا ہوا تو پتہ چلا کہ پندرہ بیس روز پہلے چندا کو لڑکا ہوا ہے،“ اور پھر جیسے محلے میں سنی سنائی باتوں پر پردہ ڈالتے ہوئے بولا، ”بھگوان کے راج میں دیر ہے اندھیر نہیں، جگپتی بھیا!“

جگپتی نے سنا تو پہلے اس نے گہری سانسوں سے منشی جی کو تاکا، لیکن وہ تیر کا نشانہ ٹھیک نہیں کھوج پایا اور برداشت کرتے ہوئے بولا، ”دیر اور اندھیر دونوں ہیں!“

”اندھیر تو سراسر ہے... تریا چرتر ہے سب! بڑے بڑے ہار گئے،“ کہتے کہتے منشی جی رک گئے، لیکن کچھ اس طرح، جیسے کوئی بڑی ہی رازدارانہ بات ہے، جسے اُن کی گول ہوتی ہوئی آنکھیں سمجھادیں گی۔

جگپتی منشی جی کی طرف تاکتا رہ گیا۔ منٹ بھر منحوس سی خاموشی چھائی رہی، اُسے توڑتے ہوئے منشی جی بڑی درد بھری آواز میں بولے، ”سن تو لیا ہوگا تم نے؟“

”کیا،“ کہنے کو جگپتی کہہ گیا، لیکن اُسے لگا کہ اب منشی جی اُس گاؤں میں پچھلی باتوں کو ہی بڑی بے دردی سے کہہ ڈالیں گے، اس نے ناحق پوچھا۔

پھر منشی جی نے اُس کی ناک کے پاس منہ لے جاتے ہوئے کہا کہ چندا دوسرے کے گھر بیٹھ رہی ہے... کوئی مدھوسدن ہے وہیں کا۔ لیکن بچہ دیوار بن گیا ہے۔ چاہتے تو وہ یہی ہیں کہ مر جائے تو راستہ کھلے لیکن رام جی کی مرضی... سنا ہے بچہ رہتے بھی وہ چندا کو

بٹھانے کو تیار ہے۔"

جگپتی کی سانس گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ بس آنکھیں منشی جی کے چہرے پر پتھرائی سی گڑی تھیں۔

منشی جی بولے، "عدالت سے بچہ تمھیں مل سکتا ہے۔۔۔ اب کاہے کی شرم اور لحاظ!"

"اپنا کہہ کر کس منہ سے مانگوں، بابا؟ ہر طرف تو قرض سے دبا ہوں، تن سے، من سے، پیسے سے، عزت سے کس کے بل پر دنیا سجانے کی کوشش کروں؟" کہتے کہتے وہ اپنے آپ میں کھو گیا۔

منشی جی وہیں بیٹھ گئے، جب رات جھک آئی تو جگپتی کے ساتھ ہی منشی جی بھی اٹھے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے گلی تک لائے۔ اپنی کوٹھری آنے پر بیٹھ سہلا کر انھوں نے اُسے چھوڑ دیا اور گردن جھکائے گلی کے اندھیرے میں وہ انھیں خیالوں میں ڈوبا یوں چلتا چلا آیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن کچھ ایسا بوجھ تھا، جو نہ سوچنے دیتا تھا اور نہ سمجھنے، جب چاچی کی بیٹھک کے پاس سے گزرنے لگا تو اچانک اس کے کانوں میں بھنک پڑی ــــ "آ گئے ستیاناسی! گھر کے تباہ کار!"

اس نے ذرا نظر اٹھا کر دیکھا تو گلی کی چاچی، بھابھیاں بیٹھک میں جمع تھیں اور چندا کا ذکر چھڑا تھا لیکن وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

اتنے دن بعد تالا کھولا اندر کے اندھیرے میں کچھ بجھائی نہ دیا، تو یکایک وہ رات اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی، جب وہ اسپتال سے چندا کے ساتھ لوٹا تھا۔ بیوہ چاچی کا زہر میں بجھا وہ تیر، 'آ گئے راجانر بنسیا اسپتال سے۔' اور آج، 'ستیاناسی! گھر کے تباہ کار!' اور خود اس کا وہ جملہ، جو چندا کو چھید گیا تھا، 'تمھارے کبھی کچھ نہ ہوگا۔۔۔!' اور اُس رات کی بچّی چندا! چندا کے لڑکا ہوا ہے۔۔۔ وہ کچھ اور جنتی، آدمی کا بچہ نہ جنتی!۔۔۔ وہ اور کچھ بھی بنتی، کنکر پتھر، وہ ناری نہ بنتی، بچی ہی بنی رہتی، اُس رات کی معصوم چندا! لیکن چندا یہ سب کیا کرنے جارہی ہے؟ اُس کے جیتے جی وہ دوسرے کے گھر بیٹھنے جارہی ہے؟ کتنے بڑے پاپ میں ڈھکیل دیا چندا کو ـــ لیکن اُسے بھی تو کچھ سوچنا چاہیے۔ آخر کیا؟ لیکن میرے جیتے جی یہ سب اچھا نہیں۔ وہ اتنی نفرت برداشت کرکے بھی جینے کو تیار ہے! یا مجھے جلانے کو! وہ مجھے

بچہ سمجھتی ہے ظالم۔ نہیں تو ایک بار خبر تو لیتی۔ بچہ ہوا تو پتہ لگتا۔ لیکن نہیں، وہ اس کا کون ہے؟ کوئی بھی نہیں! اولادہی پیار کا محور ہے جو مرد عورت کے پہیوں کو جسم کے دلدل سے نکال آگے بڑھا دیتی ہے۔۔۔ ورنہ ہر عورت رنڈی ہے اور ہر مرد ہوس کا کیڑا ہے۔ تو کیا چندا۔۔۔ عورت نہیں رہی؟ وہ ضرور عورت تھی، لیکن خود میں نے اسے دوزخ میں ڈال دیا! وہ بچہ میرا کوئی نہیں، لیکن چندا تو میری ہے۔ ایک بار اُسے لے آتا، پھر یہاں رات کے سہانے اندھیرے میں اُس کے پھول سے لبوں کو دیکھتا۔۔۔ نازک سوئی پلکوں کو دیکھتا۔۔۔ سانسوں کی دودھ سی اچھوتی مہک کو سمیٹ لیتا۔۔۔

آج کا اندھیرا! گھر میں تیل بھی نہیں ہے جو دیا جلالے۔ اور پھر کس کے لیے کوئی جلائے؟ چندا کے لیے۔۔۔ لیکن اُسے تو اُس نے بیچ دیا تھا۔ سوائے چندا کے کون سی ملکیت اس کے پاس تھی جس پر کوئی قرض دیتا؟ قرض نہ ملتا تو یہ سب کیسے چلتا؟ کام۔۔۔ پیڑ کہاں سے کٹتے؟ اور تب شکورے کے وہ الفاظ اُس کے کان میں گونج گئے، 'ہرا ہونے سے کیا اُکھڑ تو گیا ہے۔۔۔' وہ خود بھی تو ایک اُکھڑا ہوا پیڑ ہے، نہ پھل کا نہ پھول کا، سب بے کار ہی تو ہے۔ جو کچھ سوچا، اُس پر کبھی بھروسہ نہ کر سکا۔ چندا کو چاہتا رہا لیکن اُس کے دل میں یہ چاہت نہ جگا سکا۔ اسے کہیں سے ایک پیسہ مانگنے پر ڈانٹتا رہا۔ لیکن خود لیتا رہا اور آج۔۔۔ وہ دوسرے کے گھر بیٹھ رہی ہے۔۔۔ اُسے چھوڑ کر۔۔۔ وہ اکیلا ہے۔۔۔ ہر طرف بوجھ ہے، جس میں اُس کی نس نس کچلی جا رہی ہے۔ رگ رگ پھٹ گئی ہے۔۔۔ اور وہ کسی طرح ٹٹول ٹٹول کر اندر گھر میں پہنچا۔

"رانی اپنے خاندانی دیوتا کے مندر میں پہنچی،" ماں سنایا کرتی تھیں، "اپنے وجود کو پاک کرنے کے لیے انھوں نے سخت تپسیا کی۔ راجا دیکھتے رہے! خاندانی دیوتا خوش ہوئے اور انھوں نے اپنی دیوشکتی سے دونوں لڑکوں کو نوزائیدہ بچوں میں منتقل کر دیا۔ رانی کی چھاتیوں میں دودھ بھر آیا اور پستانوں سے دودھ کی دھار پھوٹ پڑی جو بچوں کے منہ میں گرنے لگی۔ راجا کو رانی کی پاکیزگی کا ثبوت مل گیا۔ رانی کے چرن پکڑ لیے اور کہا کہ تم دیوی ہو! یہ میرے بیٹے ہیں! اور اُس دن سے راجا نے پھر سے راج کاج سنبھال لیا۔۔۔"

لیکن اُسی رات جگپتی نے اپنا سارا کاروبار چھوڑ چھاڑ کر، افیم اور تیل پی کر خودکشی کرلی۔ کیونکہ چندا کے پاس کوئی آسمانی قوت نہ تھی اور جگپتی راجا نہیں، بچن سنگھ کمپاؤنڈر قرض دار تھا!۔۔۔

"راجا نے دو باتیں کیں،" ماں سناتی تھیں، "ایک تو رانی کے نام سے انھوں نے بہت بڑا مندر بنوایا۔ اور دوسرے راج کے لیے نئے سکوں پر بڑے راجکمار کا نام کھدوا کر جاری کر دیے تاکہ پرجا کو اگلے ولی عہد کی خبر ہو جائے۔۔۔"

جگپتی نے مرتے وقت دو پرچے چھوڑے، ایک چندا کے نام دوسرا قانون کے نام۔ چندا کو اُس نے لکھا تھا، "چندا، میری آخری خواہش یہی ہے کہ تم بچے کو لے کر چلی آنا۔۔۔ ابھی دو ایک دن میری لاش کی درگت بنے گی، تب تک تم آسکو گی۔ چندا، آدمی کو گناہ نہیں بلکہ احساسِ گناہ اور پچھتاوا مارتا ہے، میں بہت پہلے مر چکا تھا۔ بچے کو لے کر ضرور چلی آنا۔"

قانون کو اس نے لکھا تھا، "کسی نے مجھے مارا نہیں ہے۔۔۔ کسی آدمی نے نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے زہر کی شناخت کرنے کے لیے میرا سینہ چیرا جائے گا۔ اُس میں زہر ہے۔ میں نے افیم نہیں روپے کھائے ہیں۔ اُن روپیوں میں قرض کا زہر تھا، اُس نے مجھے مارا ہے۔ میری لاش تب تک نہ جلائی جائے، جب تک چندا بچے کو لے کر نہ آجائے۔ آگ بچے سے دلوائی جائے۔ بس۔"

ماں جب کہانی ختم کرتی تھیں، تو آس پاس بیٹھے بچے پھول چڑھاتے تھے۔ میری کہانی بھی ختم ہو گئی ہے، لیکن۔۔۔

چپّل

کہانی بہت چھوٹی سی ہے۔

مجھے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ کی ساتویں منزل پر جانا تھا، آئی سی یو میں۔ گاڑی پارک کر کے چلا تو دل بہت ہی فلسفی ہو گیا تھا۔ کتنی تکلیفیں اور مصیبتیں ہیں اس دنیا میں۔۔۔ مسلسل ایک جنگ موت سے چل رہی ہے۔۔۔ اور اُسی دکھ اور مصیبت کو سہتے ہوئے لوگ سب ایک سے ہیں۔ درد اور اذیت تو درد اور اذیت ہی ہے، چاہے وہ کسی کی ہو۔ اس میں انسان اور انسان کے درمیان تفریق نہیں کی جاسکتی۔ دنیا میں ہر ماں کے دودھ کا رنگ ایک ہے۔ خون اور آنسوؤں کا رنگ بھی ایک ہے۔ دودھ، خون اور آنسوؤں کا رنگ نہیں بدلا جاسکتا۔۔۔ شاید اُسی طرح دکھ، تکلیف اور اذیت کے رنگوں کا بھی بٹوارہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس عظیم انسانی فلسفے سے مجھے راحت ملی تھی۔۔۔ میرے اندر کی صدیاں بولنے لگی تھیں۔ ایک پرانی تہذیب کا وارث ہونے کے ناتے یہ ذہنی سکون ضرور ہے کہ تم ہر بات، ہر واقعے، یا حادثے کا کوئی نہ کوئی فلسفیانہ جواب ڈھونڈ سکتے ہو۔ حل چاہے نہ ملے، لیکن ایک ماورائی فلسفیانہ جواب ضرور مل جاتا ہے۔

اور پھر پرانی تہذیبوں کی یہ خوبی بھی ہے کہ ان کی اولادوں کو روایتی ایک روح نام کی ماورائی قوت بھی مل گئی ہے اور صدیوں پرانی تہذیب انسان کے حقیر خرابیوں کی سرکوبی کرتی رہتی ہے۔ ایک فلسفی کی نگاہ سے زندگی کی عارضیت کا احساس کرتے ہوئے ساری ناہمواریوں کو ہموار کرتی رہتی ہے۔۔۔

مجھے اپنے دوست کی باتیں یاد آئیں جس نے مجھے سندھیا کے سنگین آپریشن کی بات بتائی تھی اور اُسے دیکھ آنے کا مشورہ دیا تھا۔ اُس نے مجھے آئی سی یو میں سندھیا کے کیبن کا پتہ بتایا تھا، آٹھویں فلور پر آپریشن تھیٹرس ہیں اور ساتویں پر سندھیا کا آئی۔ سی۔ یو۔ میجر آپریشن میں سندھیا کی بڑی آنت کاٹ کر نکال دی گئی تھی اور اگلے اڑتالیس گھنٹے کریٹیکل تھے۔۔۔

راستہ ایمرجنسی وارڈ سے جاتا تھا۔ ایک بے حد درد بھری چیخ ایمرجنسی وارڈ سے آرہی تھی۔۔۔ وہ درد بھری چیخ تو درد بھری چیخ ہی تھی۔۔۔ کوئی زخمی مریض ناقابل برداشت تکلیف سے چیخ رہا تھا۔ اُس چیخ سے روح کانپ رہی تھی۔۔۔ درد کی چیخ اور درد کی چیخ میں کیا فرق تھا۔ دودھ، خون اور آنسوؤں کے رنگوں کی طرح چیخ کی تکلیف بھی تو ایک سی تھی۔ اس میں ناہمواری کہاں تھی؟

میرا وہ دوست جس نے مجھے سندھیا کو دیکھ آنے کے فرض کی ادائیگی کے لیے بھیجا تھا، وہ بھی الہ آباد کا ہی تھا۔ وہ بھی اُسی صدیوں پرانی تہذیب کا وارث تھا۔ خالص الہ آبادی سوچ میں وہ بھی فلسفی کی طرح بولا تھا ـــــ اپنا کیا ہے؟ ریٹائر ہونے کے بعد گنگا کنارے ایک جھونپڑی ڈال لیں گے۔ آٹھ دس تاڑ کا پیڑ لگالیں گے۔۔۔ مچھلی مارنے کی ایک بنسی۔۔۔ دو چار مچھلی تو دوپہر تک ہاتھ آئیں گی ہی۔۔۔ رات بھر جو تاڑ ٹپکے گی اُسے فرج میں رکھ لیں گے۔۔۔

"فرج میں؟"

"اور کیا۔۔۔ ماڈرن سادھو کی طرح رہیں گے۔ مچھلیاں تلیں گے، کھائیں گے اور تاڑ پئیں گے۔۔۔ اور کیا چاہیے۔۔۔ پنشن ملتی رہے گی۔ اور مایا موہ کیوں پالیں؟ پالیں گے تو روح پھنسی رہے گی۔۔۔ تاڑی اور مچھلی۔۔۔ بس، آتما تاڑی پی کر، مچھلی کھا کر آرام سے۔۔۔ آتما نکل جائے گی۔ نہ کوئی دکھ، نہ کوئی تکلیف۔۔۔ لیکن تم جا کر سندھیا کو دیکھ ضرور آنا۔۔۔ وہ کریٹیکل ہے۔۔۔"

میرا دوست اپنے مستقبل کے بارے میں کتنا بے فکر تھا، یہ دیکھ کر مجھے اچھا لگا تھا۔ یہ بات سوچ سوچ کر مجھے ابھی تک اچھا لگ رہا تھا۔ سوا اُس چیخ کے جو ایمرجنسی وارڈ سے اب تک آرہی تھی۔۔۔ اور مجھے ستا رہی تھی۔۔۔ اسی لیے لفٹ کے آنے میں جو دیر لگ رہی تھی وہ مجھے گراں لگ رہا تھا۔

آخر لفٹ آئی۔ سیون ـــــ سات، میں نے کہا اور سندھیا کے بارے میں سوچنے لگا۔ دو تین وارڈ بوائے تیسری اور چوتھی منزل پر اتر گئے۔

پانچویں منزل پر لفٹ رکی تو کچھ لوگ اوپر جانے کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ انھیں لوگوں میں تھا وہ پانچ سال کا بچہ ـــــ ہسپتال کی دھاری دار بہت بڑی سی قمیص پہنے ہوئے۔۔۔ شاید اس کا باپ، وہ ضرور اُس کا باپ ہوگا، اُسے گود میں اٹھائے ہوئے تھا۔۔۔ اُس بچّے کے پیروں میں چھوٹی چھوٹی نیلی ہوائی چپلیں تھیں، جو گود میں ہونے کی وجہ سے اُس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں میں الجھی ہوئی تھیں۔

اپنے پاؤں سے گرتی ہوئی چپلوں کو دھیرے سے الجھاتے ہوئے بولا، "بابا، چپّل۔۔۔"

اُس کے باپ نے چپلیں اُس کے پاؤں میں ٹھیک کر دیں۔ وارڈ بوائے وھیل چیر بڑھاتے ہوئے بولا، "آ جا، اس میں بیٹھے گا۔" بچہ ہلکے سے ہنسا۔۔۔ وارڈ بوائے نے اُسے کرسی میں بٹھا دیا۔۔۔ اُسے بیٹھنے میں کچھ تکلیف ہوئی لیکن وہ کرسی کے ہتھے پر اپنے ننّھے ننّھے ہاتھ پٹکتا ہوا ابھی ہنستا رہا۔ درد کا احساس تو اُسے بھی تھا، لیکن درد کی وجہ کا احساس اُسے بالکل نہیں تھا۔ وہ کرسی میں ایسے بیٹھا تھا جیسے شاہی تخت پر بیٹھا ہو۔۔۔ کرسی بڑی تھی اور وہ چھوٹا۔ وارڈ بوائے نے کرسی کو پُش کیا۔ وہ لفٹ میں آ گیا۔ اُس کے ساتھ ہی اُس کا باپ بھی۔ اُس کا باپ اُس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتا رہا۔

لفٹ سات پر رُکی، لیکن میں نہیں نکلا۔ دو ایک لوگ نکل گئے۔ لفٹ آٹھ پر رکی۔ یہیں آپریشن تھئیٹر تھے۔ دروازہ کھلا تو ایک نرس، جس کے ہاتھ میں سارے پرچے تھے، اُسے دیکھتے ہوئے بولی، "آ گیا تو!"

اُس بچّے نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے نرس سے جیسے کہا ـــــ ہاں! اُس کی آنکھیں نرس سے شرما رہی تھیں اور اُن میں بچپن کی بڑی معصوم دودھیا چمک تھی۔ وھیل چیر ایک جھٹکے کے ساتھ لفٹ سے باہر گئی۔۔۔ نرس نے اس کا کندھا ہلکے سے تھپکا۔۔۔

"بابا چپّل!" وہ تبھی بولا، "میری چپّل۔۔۔"

اُس کی ایک چپّل لفٹ کے پاس گر گئی تھی۔ اُس کے باپ نے وہ چپّل بھی اُسے پہنا دی۔ اُس نے دونوں پاؤں کی انگلیوں کو سمیٹا اور اپنی چپلیں پاؤں میں کس لیں۔

لفٹ بند ہوئی اور نیچے اتر گئی۔

وارڈ بوائے نیچے کی کرسی کو پش کرتا ہوا آپریشن تھئیٹر والے برآمدے میں مڑ گیا۔ نرس اُس کے ساتھ ہی چلی گئی۔ اُس کا باپ دھیرے دھیرے اُنھیں کے پیچھے چلا گیا۔

تب مجھے یاد آیا کہ مجھے تو ساتویں منزل پر جانا تھا۔ سندھیا وہیں تھی۔ میں سیڑھیوں سے ایک منزل نیچے اتر آیا۔ سندھیا کے ڈاکٹر پتی نے مجھے پہچانا اور آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ہاتھ کی گرفت میں مایوسی اور لاچاری تھی۔ کچھ پل خاموش رہی۔ پھر میں نے کہا ـــــ

"میں کل ہی واپس آیا، تبھی پتہ چلا۔ یہ اچانک کیسے ہو گیا؟"

"نہیں، اچانک نہیں۔ بلیڈنگ تو پہلے بھی ہوئی تھی پر تب کنٹرول کرلی گئی تھی۔ پندرہ دنوں بعد پھر ہونے لگی۔ ایکسیسو بلیڈنگ۔ چار گھنٹے آپریشن میں لگے۔۔۔ اینڈ یو نو، وی ڈاکٹرس آر ورسٹ پیشنٹس!" وہ سندھیا کے بارے میں بھی کہہ رہے تھے۔ سندھیا بھی ڈاکٹر تھی۔

"یس! آپ تو سب سمجھ رہے ہوں گے۔۔۔ سندھیا کو بھی ایک ایک بات کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"لیکن وہ بہت کرتجسلی بیہیو کر رہی ہے!" سندھیا کے ڈاکٹر پتی نے کہا، "بول تو سکتی نہیں۔۔۔ پلس بھی گردن کے پاس ملی۔۔۔ آرٹی فیشل ریسپریشن پر ہے۔۔۔ ایک طرح سے دیکھیے تو اُس کا سارا جسم آرام کر رہا ہے اور سب کچھ مصنوعی مدد سے ہی چل رہا ہے۔۔۔" سندھیا کے ڈاکٹر پتی زیادہ تر باتیں مجھے میڈیکل اصطلاح میں ہی بتا رہے تھے اور میں اُنھیں سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ بیچ بیچ میں اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرتا رہا۔

"سندھیا کا بھائی بھی آج صبح پہنچ گیا۔۔۔ کسی طرح اُسے جاپان ہوتے ہوئے ٹکٹ مل گیا!" انھوں نے بتایا۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔" میں نے کہا۔

"آپ دیکھنا چاہیں گے؟"

"ہاں اگر پاسیبل ہو تو۔۔۔"

"آیئے۔۔۔ دیکھ تو سکتے ہیں۔۔۔ اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔۔۔ ویسے تو سارے ڈاکٹر فرینڈس ہی ہیں پر۔۔۔"

"نہیں، نہیں وہ ٹھیک بھی ہے۔۔۔"

"وہ بول بھی نہیں سکتی۔۔۔ ویسے آج کانشس ہے۔۔۔ کچھ کہنا ہوتا ہے تو لکھ کر بتادیتی ہے۔" انھوں نے کہا اور ایک کیبن کے سامنے پہنچ کر انھوں نے اشارہ کیا۔

میں نے شیشے کی دیوار سے سندھیا کو دیکھا۔ وہ پہچان میں ہی نہیں آئی۔ دو ڈاکٹرس اور نرس اُسے اٹینڈ بھی کر رہے تھے۔۔۔ اور پھر اتنی نلیاں اور مشینیں تھیں کہ اُن کے درمیان سندھیا کو پہچاننا مشکل بھی تھا۔

سندھیا ہوش میں تھی۔ ڈاکٹر کو دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر اُس کا ایک ہاتھ سہلاتے ہوئے اُسے کچھ بتارہا تھا۔ میں نے سندھیا کو اس حال میں دیکھا تو من اداس ہو گیا۔ وہ کتنی لاچار تھی۔ بیماری اور وقت کے سامنے آدمی لاچار ہی ہوتا ہے۔۔۔ کچھ کر نہیں پاتا۔ میں نے دل ہی دل میں سندھیا کے لیے دعا کی، کس سے کی یہ نہیں معلوم۔ ایسی جگہوں پر آکر بھگوان پر دھیان جاتا بھی ہے اور کسی کے شبہ کے لیے اس کے وجود کو قبول کرنے میں کچھ نہیں جاتا ــــ سوا دعاؤں کے کچھ الفاظ کے۔

ہم آئی سی یو سے ہٹ کر پھر برامدے میں آگئے۔ وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ برامدے بیٹھنے کے لیے بنائے بھی نہیں گئے تھے۔ سندھیا یا ڈاکٹر کی بہن نیچے چادر بچھائے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر کے کچھ دوست ایک گروپ میں کھڑے تھے۔

"ابھی تو، بعد میں، ایک آپریشن اور ہوگا۔۔۔" سندھیا کے ڈاکٹر پتی نے بتایا، "تب چھوٹی آنت کو سسٹم سے جوڑا جائے گا۔۔۔ خیر، پہلے وہ اسٹیبلائز کرے، پھر ریکوری کا سوال ہے۔۔۔ اس میں ہی قریب تین مہینے لگ جائیں گے۔۔۔ اس کے بعد میں سوچتا ہوں ــــ اُسے امریکہ لے جاؤں گا۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔"

اس کے بعد ہم پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں سندھیا کی سنگین حالت سے اُن کی توجہ بھی ہٹانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ میں اور کر بھی کیا سکتا تھا اور ڈاکٹر کے سامنے یوں خاموش کھڑے رہنا اچھا بھی نہیں لگ رہا تھا۔

میں یہ جتاتے ہوئے کہ ہسپتال والوں سے چھپا کر میں سگریٹ پینا چاہتا ہوں ــــ میں کھڑکی کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔ باہر لو چل رہی تھی۔ نیچے زمین کی سطح پر کچھ لوگ آجارہے تھے۔۔۔ وہ اوپر سے بہت بے بس اور بے چارے لگ رہے تھے اور میرے دل سے

سبھی کے لیے نیک خواہشات کی ندیاں پھوٹ رہی تھیں۔۔۔ ایسے میں تم سوچو ـــــ لگتا ہے انسان نے انسان کے ساتھ تو گہرے اور گھنے رشتے بنالیے ہیں لیکن ایشور کے ساتھ وہ ایسا نہیں کرپایا ہے۔ انسان اپنے ایشور کے دکھ سکھ میں شامل نہیں ہو سکتا۔ بھگوان سے اُس کا رشتہ صرف داتا اور پاتا کا ہے۔ وہ دیتا ہے اور انسان پاتا ہے کتنا یک طرفہ رشتہ ہے یہ۔۔۔ اور پھر اگر تم یہ بھی مان لو کہ ایشور ہی انسان کو بناتا ہے تو بھگوان کی صلاحیت پر اعتماد اور گھٹنے لگتا ہے ـــــ کائنات کی ابتدا سے وہ انسان کو بناتا آرہا ہے لیکن بے شمار جاندار بنانے کے باوجود وہ آج تک ایک فطری جمیع اور مکمل انسان نہیں بنا پایا۔ کچھ کمی کہیں تو بھگوان کے نظام میں بھی ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے اُن کا پرانا فنکار کمہار انھیں مٹی سپلائی کرنے میں کچھ گھپلا کر رہا ہو۔ اس راز کا پتہ کون لگائے گا؟ راز ہی راز کو پیدا کرتا ہے۔ شاید اسی لیے انسان نے بھگوان کو راز ہی رہنے دیا۔۔۔ جو اقتدار یا طاقت یقین کی کسوٹی پر کھرا نہ اترے اُسے راز بنا دینا ہی بہتر ہے۔۔۔ اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔۔۔

لو کے ایک تھپیڑے نے میرا منہ جھلسا دیا۔ ڈاکٹر اپنے فکر مند خیر خواہوں کے گروپ میں کھڑے تھے ـــــ اور سبھی کے چہرے کچھ زیادہ محتاط تھے۔

ـــــ بلڈ پریشر گر رہا ہے۔۔۔

آئی سی یو میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی آمد و رفت سے لگ رہا تھا کہ کوئی مشکل مرحلہ سامنے ہے۔ کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ ہنڈل کچھ ڈھیلی ہو گئی تھی۔۔۔ اُسے ٹھیک کر دیا گیا ہے اور بلڈ پریشر ٹھیک سے ریکارڈ ہو رہا ہے۔۔۔ سب نے راحت کی سانس لی۔ موت سے لڑنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ بھگوان نے تو موت پیدا کی ہی ہے۔ لیکن موت تو انسان بھی پیدا کرتا ہے۔۔۔ ایک طرف زندگی کے لیے لڑتا ہے اور دوسری طرف موت بھی بانٹتا ہے ـــــ یہ کشمکش ہی تو زندگی ہے یہ کشمکش اور ثنویت ہی زندہ رہنے کی شرط ہے اور اادویت یا برابری تک پہنچنے کا ذریعہ اور نصب العین بھی۔ روحانی ادویت جب مادیت کی سطح پر آتا ہے اور انسان کے سوال سلجھاتا ہے تبھی تو وہ اجتماعی مساوات کا فلسفہ کہلاتا ہے۔۔۔

سگریٹ سے منہ کڑوا ہو گیا تھا۔ لو ویسے ہی تھپیڑے مار رہی تھی۔ سیمنٹ کے پلاسٹر کا دہکتا چلچلاتا سیلاب سامنے پھیلا تھا۔ کوئی ایک آدمی جلتے ننگے پیروں سے اُسے پار کر رہا تھا۔

میں نے پلٹتے ہوئے لفٹ کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر میرا منشا سمجھ گئے تھے لیکن تبھی

سیاست داں سے اُن کے کوئی دوست آ گئے تھے۔ شروع کی پوچھ پاچھ کے بعد وہ گٹ بھٹ بھاشن سادینے لگے ___

___ تب تو اگنی میزائل کے بعد بھارت دنیا کا سب سے طاقت ور تیسرا دیش ہو گیا ہے اور آنے والے دس برسوں میں ہمیں اب کوئی بھی طاقت عظیم طاقت بننے سے نہیں روک سکتی۔ انگلینڈ اور فرانس کی پوری آبادی سے زیادہ بڑا ہے آج بھارت کا متوسط طبقہ ۔۔۔ اپنی خوشحالی میں ۔۔۔ ہندوستانی متوسط طبقے جیسی طاقت اور خوشحالی اُن ممالک کے متوسط طبقے کے پاس بھی نہیں ہے ۔۔۔

تبھی ایک فکر مند نرس تیزی سے گزر گئی اور سناٹا چھا گیا۔ فکر کے بھاری لمحے جب کچھ ہلکے ہوئے تو میں نے پھر لفٹ کی طرف دیکھا ۔۔۔ ڈاکٹر صاحب سمجھ گئے ___

"آپ کو ڈھائی تین گھنٹے ہو گئے ۔۔۔ کیا کیا کام چھوڑ کر آئے ہوں گے ۔۔۔" اور وہ لفٹ کی طرف بڑھے۔ لفٹ آئی، لیکن وہ اوپر جا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو میری خاطر رکنا نہ پڑے۔ اس لیے میں لفٹ میں داخل ہو گیا۔

لفٹ آٹھ پر پہنچی۔ وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ لیکن ایک اسٹریچر تھا اور دو تین لوگ۔ اسٹریچر اندر آیا۔ اُس کے ساتھ لوگ بھی۔ اسٹریچر پر چادر میں لپٹا ہوا بچہ پڑا ہوا تھا۔ وہ بے ہوش تھا۔ وہ آپریشن کے بعد لوٹ رہا تھا۔ اُس کے گالوں اور گردن کے ریشمی روئیں پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔ ماتھے پر بال بھی پسینے کی وجہ سے چپکے ہوئے تھے۔

اُس کا باپ ایک ہاتھ میں گلوکوز کی بوتل پکڑے ہوئے تھا ۔۔۔ گلوکوز کی نلی کی سوئی اُس کی ننھی اور دودھ بھری بانہہ کی رگوں میں لگی ہوئی تھی ۔۔۔ اُس کا باپ مسلسل اُسے دیکھ رہا تھا ۔۔۔ وہ شاید پسینے سے ماتھے پر چپکے اُس کے بالوں کو ہٹانا چاہتا تھا۔ اس لیے اُس نے دوسرا ہاتھ اوپر کیا۔ لیکن اُس ہاتھ میں بچے کی چپلیں اُس کی انگلیوں میں الجھی ہوئی تھیں ۔۔۔ وہ چھوٹی چھوٹی نیلی ہوائی چپلیں ۔۔۔

میں نے بچے کو دیکھا ۔۔۔ پھر اُس کے معصوم باپ کو۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکل ہی گیا ___

"اس کا ۔۔۔"

"اس کی ٹانگ کاٹی گئی ہے۔" وارڈ بوائے نے باپ کی مشکل حل کر دی۔

"اوہ! کچھ ہو گیا تھا؟" میں نے جیسے اُس کے باپ سے ہی پوچھا۔ وہ مجھے دیکھ کر خاموش رہ گیا۔۔ اُس کے ہونٹ کچھ بدبدا کر تھم گئے۔۔۔ لیکن وہ بھی خاموش نہیں رہ سکا۔ ایک لمحے بعد ہی بولا ___

"جانگھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔۔۔"

"چوٹ لگی تھی؟"

"نہیں۔۔۔ سڑک پار کر رہا تھا۔۔۔ ایک گاڑی نے مار دیا۔۔۔" وہ بولا اور اس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے ٹکر مارنے والی گاڑی میری ہی تھی۔

پھر وہ بے خبر ہو کر اپنے بیٹے کو دیکھنے لگا۔

پانچویں منزل پر لفٹ رکی۔ بچوں کا وارڈ اسی منزل پر تھا۔ لفٹ میں آنے والے کئی لوگ تھے۔ وہ سب اسٹریچر نکالے جانے کے انتظار میں بے صبری سے رکے ہوئے تھے۔ وارڈ بوائے نے جھٹکا دے کر اسٹریچر نکالا تو بچہ بورے کی طرح ہل اٹھا، بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا ___

"دھیرے سے۔۔۔"

"یہ تو بے ہوش ہے۔۔۔ اسے کیا پتہ؟" اسٹریچر کو باہر پُش کرتے ہوئے وارڈ بوائے نے کہا۔

اس بچے کا باپ کھلے دروازے سے ٹکراتا ہوا باہر نکلا تو ایک نرس نے اُس کے ہاتھ کی گلوکوز کی بوتل کو پکڑ لیا۔

لفٹ کے باہر پہنچتے ہی اُس کے باپ نے اُس کی دونوں نیلی ہوائی چپلیں وہیں کونے میں پھینک دیں۔۔۔ پھر کچھ سوچ کر کہ شاید اس کا بیٹا ہوش میں آتے ہی چپلیں مانگے گا، اُس نے پہلے ایک چپل اٹھائی۔۔۔ پھر دوسری بھی اٹھالی اور اسٹریچر کے پیچھے پیچھے وارڈ کی طرف جانے لگا۔

مجھے نہیں معلوم کہ اُس کا بیٹا جب ہوش میں آئے گا تو کیا مانگے گا۔۔۔ چپل مانگے گا یا چپلوں کو دیکھ کر اپنا پیر مانگے گا۔۔۔

بے صبری سے انتظار کرتے لوگ لفٹ میں آگئے تھے۔ لفٹ مین نے بٹن دبایا۔ دروازہ بند ہوا ۔ اور وہ لوہے کا بند کمرہ نیچے اترنے لگا۔

گرمیوں کے دن

چنگی دفتر خوب رنگا چنگا ہے۔ اس کے دروازے پر سات رنگی ڈزائن کے بورڈ لگے ہیں۔ سید علی پینٹر نے بڑے فنکارانہ انداز میں بورڈ بنائے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے شہر میں بہت سی دکانیں ہو گئی ہیں۔ جن پر سائن بورڈ لٹک گئے ہیں۔ سائن بورڈ لگانا گویا اپنی وقعت میں اضافے کی دلیل اور علامت بن چکا تھا۔ بہت دن پہلے جب دینا ناتھ حلوائی کی دکان پر سائن بورڈ لگا تھا تو وہاں دودھ پینے والوں کی تعداد یکایک بڑھ گئی تھی۔ پھر تو گویا سیلاب آگیا اور نئے نئے طریقے اور بیل بوٹے ایجاد کیے گئے۔ 'ॐ' یا 'جے ہند' سے شروع ہو کر 'ایک بار ضرور آزمائیے' یا 'ملاوٹ ثابت کرنے والے کو ایک سو روپے نقد انعام' کی تحریروں اور للکاروں یا سائن بورڈوں کی عبارت کا خاتمہ بالخیر ہونے لگا۔

چنگی دفتر کا نام تین زبانوں میں لکھا ہے۔ چیرمین صاحب بڑے عقلمند آدمی ہیں۔ اُن کی سوجھ بوجھ کا ڈنکا بجتا ہے۔ اس لیے ہر سائن بورڈ ہندی، اردو اور انگریزی میں لکھا جاتا ہے۔ دور دور کے نیتا لوگ بھاشن دینے آتے ہیں۔ دیس بدیس کے لوگ آگرہ کا تاج محل دیکھ کر پورب کی طرف آتے ہوئے یہیں سے گزرتے ہیں۔ اُن پر اثر پڑتا ہے بھائی اور پھر موسم کی بات۔ میلے، تماشوں کے دنوں میں حلوائی، جولائی، اگست میں کتاب، کاغذ والوں، تیوہاروں میں کپڑے والوں اور خراب موسم میں وید اور حکیموں کے سائن بورڈوں پر نیا رنگ روغن چڑھتا ہے۔ خالص دیسی گھی والے سب سے اچھے، جو چھپروں کے اندرونی حصوں کی دیواروں پر چاک (کھریا) پنسل یا پتھر کے ٹکڑوں سے لکھ کر کام چلا لیتے ہیں۔ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔

اہمیت جتاتے ہوئے وید جی نے کہا، "بغیر پوسٹر چپکائے سنیما والوں کا کام بھی نہیں چلتا۔ بڑے بڑے شہروں میں جائیے تو مٹی کے تیل بیچنے والے کی دکان پر بھی سائن بورڈ مل جائے گا۔ بڑی ضروری چیز ہے۔ بال بچوں کے نام تک 'سائن بورڈ' ہیں۔ ورنہ نام رکھنے کی ضرورت کیا ہے؟ سائن بورڈ لگا کر سکھدیو بابو کمپاؤنڈر سے ڈاکٹر ہو گئے۔ بیگ لے کر چلنے لگے۔"

پاس بیٹھے رام چرن نے ایک اور نئے چمتکار کی خبر دی، "ارے کل انھوں نے 'بدھئی والا' تانگہ گھوڑا خرید لیا ہے؟"

"ہانکے گا کون؟" ٹن کی کرسی پر بیٹھے پنڈت جی نے پوچھا۔

"یہ سب جیب کاٹنے کے طریقے ہیں۔" وید جی کا دھیان یکہ کی طرف زیادہ تھا۔ "مریض سے کرایہ وصول کریں گے۔ سائیس کو بھی بخشش دلائیں گے، بڑے شہروں کے ڈاکٹروں کی طرح۔ اس سے پیشے کی بدنامی ہوتی ہے۔ پوچھو کہ مریض کا علاج کرنا ہے کہ رعب و مرتبہ دکھانا ہے۔ انگریزی آلے لگا کر مریض کی آدھی جان تو پہلے ہی خشک کر دیتے ہیں۔ آیورویدک طریقے سے نبض دیکھنا تو دور، چہرہ دیکھ کر مرض بتا دیں! تانگہ گھوڑا اس میں کیا کرے گا؟ تھوڑے دن بعد دیکھنا، ان کا سائیس، کمپاؤنڈر ہو جائے گا۔" یہ تقریر جھاڑ کر وید جی بڑی کریہہ ہنسی ہنسے اور پھر بول پڑے، "کوئی کیا کہے بھئی، ڈاکٹری تو تماشہ بن گئی ہے۔ وکیل مختار کے لڑکے ڈاکٹر ہونے لگے۔ بات تو خون اور تربیت سے بنتی ہے، تبھی ہاتھ میں اثر آتا ہے۔ وید کا بیٹا ہی وید ہوتا ہے۔ آدھی جان کاری تو بچپن میں جڑی بوٹیاں کوٹتے پیستے آجاتی ہے۔ تولہ، ماشہ، رتی کا ایسا انداز ہوتا ہے کہ دوائیں کم زیادہ ہو ہی نہیں سکتیں۔ دواؤں کا جادو ان کے بنانے کی ترکیب میں ہے دھنونتری ـــــ" وید جی کچھ اور کہنے جا رہے تھے کہ ایک شخص کو دکان کی طرف آتا دیکھ کر چپ ہو گئے اور بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف کچھ اس طرح دیکھنے اور گھورنے لگے کہ جیسے یہ سب گپ شپ میں وقت برباد کرنے والے نہیں، اُن کے مریض ہیں۔

اُس شخص کے دکان پر چڑھتے ہی وید جی نے بھانپ لیا۔ مایوس ہو کر اُنھوں نے اُسے دیکھا اور اُداس ہو گئے لیکن دنیا میں دکھاوا بھی کچھ اثر رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کل یہی آدمی بیمار پڑ جائے یا اس کے گھر کے دوسرے کسی فرد کو کوئی مرض آ دبوچے، اس لیے اپنا برتاؤ درست اور پیشے میں بڑا پن برقرار رکھنا چاہیے۔ یہ سوچ کر اُنھوں نے اپنے آپ کو سنبھالتے

ہوئے کہا، "ہو بھائی اچھے تو ہو؟" اس شخص نے رسمی جواب دیتے ہوئے ایک کنستر سامنے کر دیا اور بولا، "یہ ٹھاکر صاحب نے بھجوایا ہے۔ اسے رکھیے۔ وہ ایک ڈیڑھ بجے کے قریب منڈی سے لوٹتے ہوئے اسے لیتے جائیں گے۔"

"اس وقت دکان بند رہے گی۔" وید جی نے اس بیگار سے جھلا کر کہا، "حکیم ویدوں کی دکانیں دن بھر نہیں کھلی رہتیں بیوپاری تھوڑے ہیں بھائی۔" لیکن ایک دم خیال آیا اور کسی دوسرے دن اور موقع کی امید نے جیسے زبردستی کہلوایا، "خیر انھیں دقت نہیں ہوگی۔ ہم نہیں ہوں گے تو بغل والی دکان سے اٹھا لیں گے، میں رکھتا جاؤں گا۔"

اس شخص کے جاتے ہی وید جی نے پھر "چھان پھٹک" شروع کر دی۔ کہنے لگے "شراب بندی سے کیا ہوتا ہے؟ جب سے ہوئی ہے تب سے کچی شراب کی ناجائز بھٹیاں گھر گھر چالو ہو گئی ہیں۔ رس گھی کے بھاؤ بکنے لگا ہے اور ان ڈاکٹروں کو کیا چاہیے۔ ان کی دکانیں بڑھ گئی ہیں۔ لائسنس ملتا ہے دوا کی طرح استعمال کرنے کا۔ لیکن 'جنجر' کھلے عام فروخت ہوتا ہے۔ کہیں کچھ نہیں ہوتا۔ ہم بھنگ، افیم کی ایک پڑیا چاہیں تو تفصیل دینی پڑتی ہے۔"

"ذمہ داری کی بات ہے،" پنڈت جی بولے۔

"اب ذمہ دار وید ہی رہ گئے ہیں، سب کی تو رجسٹری ہو چکی بھائی! ایرے غیرے، پنچ کلیانی جتنے گھس آئے تھے، ان کی صفائی ہو گئی۔ اب جس کے پاس رجسٹری ہو گی، وہی وید کا پیشہ کر سکتا ہے، چورن فروش تک وید بن بیٹھے تھے۔ سب ختم ہو گئے۔ لکھنؤ میں صحیح جانچ پڑتال کے بعد رجسٹری ہوتی ہے۔"

وید جی کی باتوں سے اکتا کر پنڈت جی اٹھ گئے۔ وید جی نے اندر کی طرف قدم بڑھائے اور دواخانے کے بورڈ لکھنے والے چندر سے بولے، "سفید گاڑھا ہے بابو، تارپین ملا لو۔" اور پھر خود ہی ایک بوتل اٹھا لائے جس پر 'اشوکا رسٹ' کا لیبل تھا۔

اسی طرح نہ جانے کن کن دواؤں کی جسم نما بوتلوں میں کس کس کی روح بھری ہے۔ سامنے کی اکیلی الماری میں بڑی بڑی بوتلیں رکھی ہیں۔ جن پر مختلف ادویات کے نام لیبل اور چٹ چپکی ہوئی ہیں۔ صرف پہلی قطار میں شیشیاں کھڑی ہوئی ہیں۔۔۔ ان کے پیچھے ضرورت کے اور سامان ہیں۔ سامنے کی میز پر سفید شیشوں کی ایک قطار ہے۔ جس میں کچھ ذائقہ دار چورن، لون بھاسکر وغیرہ ہیں۔ باقی میں جو کچھ بھی بھرا ہے اسے وید جی جانتے ہیں!

تارپین کا تیل ملا کر چندر لکھنے لگا، 'پروفیسر کوٹی رام، متیا نند تیواری۔' اوپر کے حصے میں 'شری دھنونتری اوشدھالیہ' خود ویدجی لکھ چکے تھے۔ سفیدی کے حروف ایسے لگ رہے تھے جیسے روئی کے پھاہے چپکا دیے گئے ہوں۔ اوپر خالی جگہ دیکھ کر ویدجی بولے، "بابو اوپر 'جے بند' لکھ دینا اور یہ جو جگہ بچ رہی ہے اس میں ایک طرف دراکشسو کی بوتل بنا دینا اور دوسری طرف کھرل کی تصویر کاڑھ دینا۔" پھر بولے، "چندر بابو! آرٹ ہمارے پاس مڈل تک تھا۔ لیکن یہ تو مشق اور ہاتھ منجھنے کی بات ہے۔"

چندر بھی تنگ آ گیا تھا۔ سوچنے لگا، خواہ مخواہ پکڑا گیا۔ لکھائی اچھی ہونے کا یہ انعام اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ بولا، "کسی پینٹر سے بنوا لیتے۔ اچھا خاصا لکھ دیتا۔ میری لکھائی میں شاید وہ بات نہیں آئے گی؟"

اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے برش نیچے رکھ دیا۔

"پانچ روپے مانگتا تھا بابو۔۔۔ دو لائن کے پانچ روپے! اپنی محنت کے ساتھ یہ سائن بورڈ دس بارہ آنے کا پڑا۔ یہ رنگ ایک مریض دے گیا۔ بجلی کمپنی کا پینٹر، بدہضمی سے پریشان تھا۔ دو خوراکیں بنا کر دے دیں۔ پیسے نہیں لیے۔ چنانچہ وہ دو تین قسم کے رنگ اور تھوڑی سی وارنش دے گیا۔ دو صندوق رنگے جا چکے تھے۔ یہ بورڈ بھی بن گیا۔ اور ایک آدھ کرسی بھی رنگ جائے گی۔ تم بس اتنا لکھ دو۔ لال رنگ کا شیڈ ہم دیتے رہیں گے۔۔۔ حاشیہ ترنگا کھلے گا؟" ویدجی نے پوچھا اور خود ہی منظوری بھی دے دی۔

چندر گرمی سے پریشان تھا۔ جیسے جیسے دوپہر قریب آتی جا رہی تھی۔ سڑک پر دھول اور لو کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ تکلیف میں چندر بول نہیں پا رہا تھا۔ حالانکہ اس کا جی یہی چاہ رہا تھا کہ ویدجی کا بورڈ نہ لکھے۔ پنکھے سے اپنی پیٹھ کھجلاتے ہوئے ویدجی نے اُجرت کے کام والے، پٹواریوں کے بڑے بڑے رجسٹر پھیلانا شروع کیا۔

سورج کی حدت اور تپش سے بچنے کے لیے دکان کا ایک کواڑ بھیڑ کر ویدجی خالی رجسٹروں پر 'خسرہ کھتونیوں سے' منتقل کرنے لگے۔ چندر نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے پوچھا، 'یہ سب کیا ہے ویدجی؟'

ویدجی کا چہرہ اتر گیا۔ بولے، "خالی بیٹھنے سے اچھا ہے کہ کچھ کام کیا جائے۔ نئے لیکھ پالوں کو کام وام آتا نہیں روزی قانون گو، میاں نائب صاحب کی ڈانٹ پھٹکار سنتے ہیں۔ جھک

مار کر اُن لوگوں کو یہ کام اُجرت پر کرانا پڑتا ہے۔ اب وہ پرانے گھاگ پٹواری کہاں رہے، جن کے پیٹ میں قانون بسا ہوتا تھا۔ روٹیاں چھن گئیں بیچاروں کی۔ لیکن سچ پوچھو تو اب بھی سارا کام پرانے پٹواری ہی ڈھو رہے ہیں۔ نئے لیکھ پالوں کی تنخواہوں کا سارا روپیہ اسی اُجرت میں نکل جاتا ہے۔ پیٹ تو اُن کا بھی ہے... اُلٹا سید ھا کر کے کسانوں سے نکال لاتے ہیں۔ نہ لائیں تو کھائیں کیا؟ دو تین لیکھ پال اپنے ہیں اُن ہی سے کبھی کبھار ہلکا بھاری کام مل جاتا ہے، منتقلی کا کام رجسٹر بھرتے ہیں۔"

باہر سڑک ویران ہوتی جا رہی تھی۔ دفتر کے بابو لوگ جا چکے تھے۔ سامنے چنگی میں خس کی ٹٹیوں پر چھڑکاؤ شروع ہو گیا تھا۔ دور سے لو کے ساتھ پیپل کے شور کی آواز آ رہی تھی۔ تب ہی ایک آدمی نے کواڑ سے اندر جھانکا۔ وید جی کی بات جو شاید لمحہ دو لمحہ کے بعد درد سے بوجھل ہو جاتی، رک گئی۔ ان کی نگاہ نے آدمی کو پہچانا اور وہ سنبھل گئے۔ فوراً بولے، "ایک بورڈ آگرہ سے بنوایا ہے، جب تک وہ نہیں آ جاتا، اسی سے کام چلے گا۔ فرصت کہاں ملتی ہے جوان سب بکھیڑوں میں پڑیں" اور پھر ایک دم مصروفیت کے انداز میں اُنھوں نے اُس آدمی سے سوال کیا، "کہو بھائی کیا بات ہے؟"

ڈاکدری سرٹیفکیٹ چاہیے۔ کوسا ٹیشن پر خلاصی ہیں گے صاحب۔" ریلوے کی نیلی وردی پہنے ہوئے خلاصی نے اپنی غرض و غایت بتائی۔

اُس کی ضرورت کا پورا اندازہ کرتے ہوئے وید جی بولے، "ہاں! کس تاریخ سے کب تک کا چاہیے؟"

"پندرہ دن پہلے آئے تھے صاحب، سات دن کا اور دید تیجئے۔"

کچھ حساب جوڑ کر وید جی بولے، "دیکھو بھائی، سرٹیفکیٹ پکا کر کے دیں گے، سرکار رجسٹر نمبر دیں گے اور چار روپے لیں گے۔" وید جی نے جیسے خود چار روپے پر اُس کے بھڑک جانے کا احساس کرتے ہوئے کہا، "اگر پچھلا نہ لو تو دو روپے میں کام چل جائے گا۔"

خلاصی مایوس ہو گیا۔ لیکن اُس کی مایوسی سے زیادہ ملال وید جی کے پسینے میں بھیگے چہرے پر ظاہر ہو گیا۔ بڑی لجاجت سے خلاصی بولا، "سوبرن سنگھ نے آپ کے پاس بھیجا تھا۔" اُس کے کہنے سے کچھ ایسا لگا جیسے یہ اُس کا کام نہ ہو، سوبرن سنگھ کا کام ہو، مگر وید جی نبض پر ہاتھ رکھ چکے تھے۔ "وہ تو ہم پہلے ہی سمجھ رہے تھے۔ بغیر جان پہچان کے ہم

سر ٹیفکیٹ دیتے بھی نہیں، عزت کا سوال ہے۔ ہمیں کیا معلوم تم کہاں رہے، کیا کرتے رہے؟ اب سوچنے کی بات ہے؟۔۔۔ اعتبار کر کے یہ خطرہ بھی مول لیں گے۔ پندرہ دن پہلے سے تمھارا نام رجسٹر پر چڑھا لیں گے، مرض کیا تھا وہ درج کر لیں گے، ہر تاریخ کے آگے نام لکھیں گے۔ تب جا کر بات بنے گی۔ گھر کی کھیتی نہیں ہے۔۔۔" کہتے کہتے اُنھوں نے چندر کی طرف مدد کے لیے دیکھا، چندر نے بھی بات نبھاتے ہوئے کہا، "سچ تو ہے، اب اُنھیں کیا پتہ کہ تم بیمار رہے کہ ڈالی ڈالتے رہے۔۔۔ سرکاری معاملہ ہے۔۔۔"

"پانچ سے کم میں دنیا کا کوئی ڈاکٹر نہیں دے سکتا؟" کہتے کہتے ویدجی نے، سامنے رکھا لیکھ پال والا رجسٹر کھسکاتے ہوئے جوش میں کہا، "ارے دم مارنے کی فرصت نہیں ہے' یہ دیکھو۔ دیکھتے ہو نا؟۔۔۔ مریضوں کو چھوڑ کر سرکار کو دکھانے کے لیے یہ تفصیل وار رجسٹر بنانے پڑتے ہیں۔ ایک ایک مریض کا نام، مرض، آمدنی۔۔۔ ان ہی میں تمھارا نام چڑھانا پڑے گا۔ اب بتاؤ کہ مریضوں کو دیکھنا ضروری ہے کہ دو چار روپے کے لیے سر ٹیفکیٹ دے کر اس سرکاری 'کیچڑ' میں پھنسنا۔' یہ کہتے ہوئے انھوں نے تفصیل والا رجسٹر ایک جھٹکے سے بند کر کے سامنے سے ہٹا دیا اور صرف احسان کرنے کے لیے تیار ہونے جیسی صورتِ حال بنا کر قلم سے کان کریدنے لگے۔

ریلوے کا خلاصی ایک منٹ تک بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ پھر ویدجی کو سر جھکائے اپنے کام میں مشغول دیکھ کر دکان سے نیچے اتر گیا، ایک دھچکا سا لگا اور ویدجی نے اپنی غلطی محسوس کی۔ اُنھیں احساس ہو گیا کہ اُنھوں نے بات غلط جگہ توڑ دی اور ایسی توڑی کہ ٹوٹ گئی۔ کچھ فوری طور پر اُن کی سمجھ میں نہیں آیا تو اُسے پکار کر بولے، "ارے سنو! ٹھاکر سوبرن سنگھ سے ہمارا 'جے رام جی' کہہ دینا۔ اُن کے بال بچے تو اچھے ہیں نا؟"

"ہاں سب ٹھیک ٹھاک ہیں،" رک کر خلاصی نے کہا۔

اُسے سنانے کے لیے ویدجی نے چندر سے کہا، "دس گاؤں چھوڑ کر سوبرن سنگھ علاج کے لیے یہیں آتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے بھائی کہ ہم بھی اُن کے لیے ہمیشہ حاضر رہے۔" چندر نے بورڈ پر آخری حرف پورا کرتے ہوئے پوچھا، "چلا گیا کیا؟"

"ارے لوٹ کے پھر یہیں آئے گا۔" ویدجی نے جیسے اپنے آپ کو سمجھایا، اور اُس کے لوٹ آنے کے یقین کو پکا کرتے ہوئے بولے، "گاؤں کے وید اور وکیل ایک ہی ہوتے

ہیں۔ سوبرن سنگھ نے اگر ہمارا نام لیا ہے تو وہ ضرور واپس آئے گا۔ گاؤں والوں کی سمجھ ذرا مشکل سے کھلتی ہے۔ کہیں بیٹھ کے سوچے گا، سمجھے گا، تب آئے گا۔"

"اور کہیں سے لے لیا تو؟" چندر کے لہجے میں تشویش تھی مگر ویدجی نے جھٹ بات کاٹتے ہوئے کہا، "نہیں بابو، ایسا نہیں ہوگا۔" اور پھر بورڈ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے، "واہ بھئی، چندر بابو! سائن بورڈ بچ گیا۔۔۔ کام چلے گا۔ یہ پانچ روپے جو میں پینٹر کو دیتا، مریضوں سے وصول کرنے پڑتے۔ تانگہ گھوڑا اور یہ خرچ! بات ایک ہے۔ چاہے ناک سامنے سے پکڑلو، چاہے گھما کر۔ سیّد علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا بورڈ مریضوں کو اچھا تو نہیں کردیتا۔ اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔ کہتے ہوئے وہ دھیرے سے ہنس پڑے۔ پتہ نہیں وہ اپنی بات سمجھ کر اپنے آپ پر ہنستے تھے یا دوسروں پر!

اُسی وقت ایک شخص آیا۔ ایسا لگا کہ خلاصی آ گیا، مگر وہ پانڈو مریض تھا۔ دیکھتے ہی ویدجی کا چہرہ پُر سکون ہو گیا۔ وہ اندر آ گئے اور ایک تعویذ لاتے ہوئے بولے، "اب اس کا اثر دیکھنا۔ بیس پچیس روز میں ہی اس کا چمتکار ظاہر ہو جائے گا۔ پانڈو مریض بازو پر تعویذ باندھ کر اور اُس کے کچھ آنے اور پیسے جیب میں ڈال کر ویدجی قدرے گمبھیر سے ہو کر بیٹھ گئے۔ مریض جب چلا گیا تو بولے، "یہ علم بھی میرے پتاجی کے پاس تھا۔ اُن کی لکھی کتابیں پڑی ہیں۔ بہت سوچتا ہوں، اُنھیں پھر سے نقل کرلوں۔۔۔ بڑے تجربے کی باتیں ہیں۔ اعتقاد کی بات ہے بابو، کہ ایک چٹکی دھول سے آدمی اچھا ہو سکتا ہے۔ ہومیو پیتھک اور بھلا ہے کیا؟ ایک چٹکی شکر۔ جس پر بھروسہ ہو جائے اور بس!"

چندر نے جاتے جاتے کہا، "اب تو دواخانہ بند کرنے کا وقت ہو گیا۔ کھانا کھانے نہیں جایئے گا؟"

"تم چلو، ہم پانچ دس منٹ بعد آئیں گے۔" ویدجی نے تحصیل والا کام اپنے آگے سرکا لیا۔ دکان کا دروازہ بھیڑ کر بیٹھ گئے۔ باہر دھوپ کی طرف دیکھنے سے آنکھیں چندھیاتی تھیں۔

بغل والے دکان دار بچن لال نے دکان بند کر کے، گھر جاتے ہوئے ویدجی کی دکان کھلی دیکھ کر پوچھا، "آپ کھانا کھانے نہیں گئے؟"

"ہاں، ایسے ہی ایک ضروری کام ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے۔"

ویدجی نے کہا۔ اور زمین پر چٹائی بچھائی۔ کاغذ اور رجسٹر میز سے اٹھا کر نیچے پھیلا لئے۔ لیکن گرمی تو گرمی! پسینہ رکتا ہی نہیں تھا۔ رہ رہ کر پنکھا جھلتے، پھر نقل کرنے لگتے۔ کچھ دیر تو جبر کر کے کام کیا، پھر ہمت چھوٹ گئی۔ اٹھ کر پرانی دھول پڑی شیشیاں جھاڑنے لگے۔ انھیں قطار سے قرینے سے رکھا۔ لیکن گرمی کی دوپہر۔ وقت جیسے رک گیا تھا۔ ایک بار انھوں نے کواڑوں کے درمیان سے منہ نکال کر دیکھا۔ سڑک پر نظر دوڑائی۔ ایک آدھ لوگ نظر آئے۔ اُن آتے جاتے لوگوں کی موجودگی سے جیسے ڈھارس بندھ گئی۔ اندر آئے، بورڈ کا تار سیدھا کیا اور اُسے دکان کے سامنے لٹکا دیا۔ "دھنونتری اوشدھالیہ" کا بورڈ دکان کی گردن میں تعویذ کی طرح لٹک گیا۔

کچھ اور وقت گزر گیا۔ آخر انھوں نے ہمت کی۔ ایک لوٹا پانی پیا اور چوکھوں تک دھوتی سرکا کر مستعدی سے کام میں جٹ گئے۔ باہر کچھ آہٹ ہوئی۔ تعجب سے انھوں نے دیکھا۔

"آج آرام کرنے نہیں گئے ویدجی؟" گھر جاتے ہوئے جان پہچان کے ایک دکان دار نے پوچھا۔

"بس جانے کی سوچ رہا ہوں۔ کچھ کام بچ گیا تھا، سوچا کر تا چلوں۔" یہ کہہ کر ویدجی دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔ کرتا اُتار کر، ایک طرف رکھ دیا۔ اکہری چھت کی دکان آنچ سے تپ رہی تھی۔ ویدجی کی آنکھیں نیند سے بری طرح بوجھل ہو رہی تھیں۔ ایک جھپکی آ گئی۔ کچھ وقت ضرور بیت گیا تھا۔ نہیں رہا گیا تو رجسٹروں کا تکیہ بنا کر انھوں نے کمر سیدھی کی۔ مگر نیند آتی اور پھر اُچٹ جاتی۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔

اچانک ایک آہٹ نے انھیں چونکا دیا۔ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بچن لال دوپہر کے کھانے اور لوٹ پوٹ کرنے کے بعد واپس آ گیا تھا۔

"ارے! آج آپ ابھی تک گئے نہیں؟" اُس نے پوچھا۔

ویدجی بولے، "نہیں۔" اور زور سے پنکھا جھلنے لگے۔ بچن لال نے دکان سے اترتے ہوئے پوچھا، "کسی کا انتظار ہے کیا؟"

"ہاں! ایک مریض آنے کو کہہ گیا تھا۔۔۔ ابھی تک آیا نہیں۔۔۔" ویدجی نے بچن لال کو جاتے دیکھا تو جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ چپ ہو گئے اور پسینہ پونچھنے لگے۔

کھوئی ہوئی دشائیں

سڑک کے موڑ پر لگی ریلنگ کے سہارے چندر کھڑا تھا۔ سامنے دائیں بائیں آدمیوں کا سیلاب تھا۔ شام ہو رہی تھی اور کناٹ پلیس کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ تکان سے اس کے پیر جواب دے رہے تھے۔ کہیں دور آیا گیا بھی تو نہیں۔ پھر بھی تکان تمام بدن میں بھری ہوئی تھی۔ دل و دماغ اس قدر تھکا ہوا تھا کہ معلوم ہو تا تھا وہی تکان آہستہ آہستہ بدن میں پھیلتی جا رہی ہے۔

سارا دن برباد ہو گیا۔ یہی کھڑا سوچ رہا تھا۔ گھر لوٹنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ آتی جاتی ایک سی عورتوں کو دیکھ کر دل اور بھی اوبنے لگتا تھا۔

بھوک۔۔۔ معلوم نہیں لگی ہے یا نہیں! وہ دماغ پر زور ڈالتا ہے۔۔۔ سویرے آٹھ بجے گھر سے نکلا تھا۔ ایک پیالی کافی کے علاوہ تو کچھ پیٹ میں نہیں گیا۔۔۔ اور تب اُس کو احساس ہوا کہ تھوڑی تھوڑی بھوک لگ رہی ہے۔ دماغ اور پیٹ کا ساتھ ایسا ہو گیا ہے کہ بھوک بھی سوچنے سے لگتی ہے۔

نگاہ دور آسمان پر اٹک جاتی ہے۔ جہاں چیلیں اڑ رہی ہیں اور موزے کی صورت میں کٹا ہوا آسمان نظر آ رہا ہے۔ اس گدلے آسمان کے نیچے جامع مسجد کا گنبد اور مینار نظر آ رہا ہے۔ ان کی نوکیں بڑی عجیب سی معلوم ہو رہی ہیں۔

عقب والی دکان کے باہر چولیوں کا اشتہار ہے۔ ریگل بس اسٹاپ کے نیم کے درختوں سے آہستہ آہستہ پتیاں جھڑ رہی ہیں۔ بسیں جوں جوں کرتی آتی ہیں ایک لمحہ ٹھٹکتی

ہیں ایک جانب سے سواریوں کو اُگلتی ہیں اور دوسری جانب سے نگل کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ چوراہے پر قمقمے لگے ہیں۔ قمقموں کی آنکھیں لال پیلی ہو رہی ہیں۔ آس پاس سے سینکڑوں لوگ گزرتے ہیں۔ لیکن کوئی اس کو نہیں پہچانتا۔ ہر آدمی یا عورت لاپروائی سے دوسروں کی نفی کرتا یا جھوٹے غرور میں ڈوبا ہوا گزر جاتا ہے۔

اور تب اُس کو اپنا وہ شہر یاد آتا ہے جہاں سے تین سال پہلے وہ چلا آیا تھا۔ گنگا کے سنسان کنارے پر بھی اگر کوئی انجان مل جاتا تو اُس کی نظروں میں پہچان کی ایک جھلک تیر جاتی تھی۔

اور یہ راجدھانی! جہاں سب اپنا ہے، اپنے دیش کا ہے۔۔۔ لیکن کچھ بھی اپنا نہیں۔ اپنے دیش کا نہیں ہے۔

تمام سڑکیں جن پر وہ جا سکتا ہے لیکن وہ سڑکیں کہیں نہیں پہنچاتیں۔ ان سڑکوں کے کنارے گھر ہیں، روشنیاں ہیں لیکن کسی بھی گھر میں وہ نہیں جا سکتا۔ ان گھروں کے باہر پھاٹک ہیں۔ جن پر کتوں سے ہوشیار رہنے کی تنبیہہ لکھی ہے۔ پھول توڑنے کی ممانعت ہے اور گھنٹی بجا کر انتظار کرنے کی مجبوری ہے۔

۔۔۔ گھر پر نرملا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہاں پہنچ کر بھی پہلے مہمان کی طرح کرسی پر بیٹھنا ہوگا۔ کیونکہ بستر پر کمرہ کا تمام سامان آراستہ ہوگا اور وہ ہیٹر پر کھانا بنا رہی ہوگی۔ بے نیاز ہو کے وہ ہوا کے جھونکے کی مانند کمرہ میں گھس بھی نہیں سکتا اور نہ اُس کو بازوؤں میں بھر کے پیار ہی کر سکتا ہے۔ کیونکہ گپتا جی ابھی مل سے لوٹے نہیں ہوں گے اور مسز گپتا بیکاری میں بیٹھی گپ لڑا رہی ہوں گی یا کسی سوئیٹر کی بنائی سیکھ رہی ہوں گی۔ اگر وہ چلا بھی گیا تو کمرے میں بہت ادب سے داخل ہوگا۔ پھر مسز گپتا سے اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کرے گا۔ تب بیوی کھانا کھانے کی بات کہے گی اور کھانے کی بات سن کر مسز گپتا گھر جانے کے لیے اٹھیں گی۔۔۔

اور پھر اس کے بعد بڑی کھڑکی کا پردہ کھسکانا پڑے گا۔ کسی بہانے کمرا نا کی طرف والی کھڑکی کو بند کرنا پڑے گا۔ گھوم کر میز کے قریب پہنچنا ہوگا اور تب پانی کا ایک گلاس منگانے کے بہانے وہ بیوی کو بلائے گا اور تب اس کو بازوؤں میں بھر کے پیار سے یہ کہہ سکنے کا

موقع آئے گا بہت تھک گیا ہوں۔

لیکن ایسا ہوگا نہیں۔ اتنے لمبے احساس میں گزرنے سے قبل ہی اُس کا دل جھنجھلا اٹھے گا اور یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا، "ارے بھئی کھانے میں کتنی دیر ہے؟" سارا پیار اور تمام پہچان نہ جانے کہاں چھپ چکی ہوگی۔ عجیب سا بیگانہ پن ہوگا۔ بیکری والوں کے یہاں بھرائی آواز میں ریڈیو گا رہا ہوگا اور گلائی کے تھکے قدموں کی کھوکھلی آواز زینہ پر سنائی پڑے گی۔

گلی میں کوئی اسکوٹر آکر رکے گا اور اُس میں سے کوئی بن پہچانا آدمی کسی جانب کے گھر میں چلا جائے گا۔ موٹروں کی مرمت کرنے والے گیرج کے مالک سردار چابیاں لے کر گھر جانے کے انتظار میں آدھی رات تک بیٹھا رہے گا کیونکہ اُس کو پندرہ سال پرانے مکینک پر بھی شاید بھروسہ نہیں ہے۔

اور سامنے رہنے والے بشن کپور کے آنے کی آہٹ پھر ملے گی۔ گزشتہ دو سال سے اس نے نام کی پلیٹ دیکھی ہے۔ بشن کپور، جرنلسٹ۔۔۔ اور اس کی شکل کے بارے میں صرف یہ جانتا ہے کہ سامنے والی کھڑکی سے جب بجلی کی روشنی چھننے لگتی ہے اور سگریٹ کا دھواں سلاخوں سے لپٹ لپٹ کر باہر کی تاریکی میں ڈوب جاتا ہے تو بشن کپور نام کا ایک آدمی اندر ہوتا ہے اور صبح جب اُس کی کھڑکی کے نیچے انڈے کا چھلکا، ڈبل روٹی کا ریپر اور جلی ہوئی سگریٹیں، تیلیاں اور راکھ بکھری ہوئی ہوتی ہیں تو بشن کپور نام کا آدمی جا چکا ہوتا ہے۔

سوچتے سوچتے اس کو لگا کہ موزے کی بدبو اور بھی تیز ہوتی جا رہی ہے اور اب ریلنگ کے قریب کھڑا رہنا مشکل ہے۔ جیب سے ڈائری نکال کر اُس نے اگلے دن کی ملاقاتوں کے بارے میں جان لینا چاہا۔

۔۔۔ انگریزی ڈیلی میں پہلے فون کرنا ہے پھر وقت طے کر کے ملنا ہے۔ ریڈیو میں ایک چکر لگانا ہے۔ پچھلا چیک ریزرو بینک سے کیش کرانا ہے۔ اور گھر ایک منی آرڈر بھیجنا ہے۔ کل کا پورا وقت بھی اسی میں نکل جائے گا۔ کیونکہ اخبار کا مدیر واقف نہیں ہے جو فوراً بلا لے اور بے تکلف بات کرے اور کوئی بات طے ہو جائے۔ ریڈیو میں بھی کوئی بات دس منٹ میں طے نہیں ہو سکتی اور ریزرو بینک کے کاؤنٹر پر الہ آباد والا امرناتھ نہیں ہے جو فوراً چیک لے کر روپیہ لا دے۔ ڈاکخانہ پر بیوپاریوں کے چپراسیوں کی بھیڑ ہوگی جو دس دس منی آرڈر کے فارم لیے لائن میں کھڑے ہوں گے اور ایک کاغذ پر پوری رقم اور منی آرڈر کمیشن

کا میزان لگانے میں مشغول ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی اس کو نہیں پہچانتا ہوگا۔

ایک لمحہ کی جان پہچان کا سلسلہ صرف پین ہوگا جو کوئی نہ کوئی دو حرف لکھنے کے لیے مانگے گا اور لکھ چکنے کے بعد اپنا خط پڑھتے ہوئے وہ بائیں ہاتھ سے اس کو قلم لوٹا کے شاید دھیرے سے تھینک یو کہے گا اور ٹکٹ والے کاؤنٹر کی طرف بڑھ جائے گا۔

اور تب اُس کو جھنجھلاہٹ سی ہوئی۔ ڈائری ہاتھ میں تھی اور اس کی نگاہیں پھر دور کی اونچی عمارتوں پر اٹک گئی تھیں جن پر بجلی کے قمقمے جگمگا رہے تھے اور اُن ناموں میں سے وہ کسی کو بھی نہیں جانتا تھا۔ الہ آباد میں سب سے بڑے کپڑے والے کے متعلق اتنا تو معلوم تھا کہ پہلے وہ بہت غریب تھا اور کندھے پر کپڑا رکھ کر پھیری لگاتا تھا اور اب اُس کا لڑکا بدیس میں پڑھنے گیا ہوا ہے اور وہ خود بہت مذہبی آدمی ہے جواب پیشانی پر چھاپہ تلک لگا کر حسب منشا منافع وصول کرتا ہے اور کارپوریشن کا الیکشن لڑنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ یہاں کچھ بھی پتہ نہیں چلتا، کسی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں پڑتا۔

کناٹ پلیس میں کھلے ہوئے لان ہیں۔ تنہا درخت ہیں۔ اور اُن دور دور کھڑے تنہا درختوں کے تلے کارپوریشن کی بینچیں ہیں جن پر تھکے ہوئے لوگ بیٹھے ہیں اور ان میں ایک آدھ بچے دوڑ رہے ہیں۔ بچوں کی شکلیں اور شرارتیں تو بہت پہچانی سی لگتی ہیں لیکن گول گپے کھاتی ہوئی اُن کی ممی اجنبی ہے کیونکہ اُس کی آنکھوں میں معصومیت اور گرم جوشی سے بھری محبت نہیں ہے۔ اُس کے جسم میں شفقت کی خوبصورتی اور غرور بھی نہیں ہے۔ اس میں صرف ایک خمار ہے اور ایک بہت بے معنی اور گھسی پٹی ہوئی للکار ہے جس کو نہ قبول کیا جا سکتا ہے اور نہ انکار کیا جا سکتا ہے۔ وہ للکار سب کانوں میں گونجتی ہے اور سب بہروں کی طرح گزر جاتے ہیں۔

لان پر کچھ لمحہ بیٹھنے کو جی چاہا لیکن اُس کو لگا کہ وہاں بھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ابھی کل ہی تو چور کی طرح دبے پاؤں گھاس میں بہتا ہوا پانی آیا تھا اور اُس کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔

تنہا کھڑے درختوں اور اُن کے نیچے سمٹے اندھیرے میں عجیب سا خلا تھا۔ تنہائی ہی سہی لیکن اُس میں خلوص تو ہو۔ وہ تنہائی بھی کسی کی نہیں ہے کیونکہ ہر دس منٹ بعد پولس کا

آدمی ادھر سے گھومتا ہوا نکل جاتا ہے۔ جھاڑیوں کی سوکھی ٹہنیوں میں آئس کریم کے خالی کاغذ اور چنے کی خالی پڑیاں الجھی ہوئی ہیں۔ بے گھربار آدمی شراب کی خالی بوتل پھینک کر چلا گیا ہے۔

ڈائری پر پھر اُس کی نظر جم گئی ہے اور شور شرابے سے بھرے اُس سیلاب میں وہ بہت اکیلا سا محسوس کرتا ہے اور لگتا ہے کہ ان تین سالوں میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا جو اُس کا اپنا ہو۔ جس کی خلش ابھی تک ہو، جوش یا درداب بھی موجود ہو۔ ریگستان کی طرف پھیلی ہوئی تنہائی ہے۔ انجان ساحلوں کی طرح خاموشی اور ویرانی ہے اور پچھاڑ کھاتی ہوئی لہروں کا محض شور ہے جس سے وہ خاموشی مزید گہری ہوتی ہے۔

موزے کی شکل میں کٹا ہوا آسمان ہے اور جامع مسجد کے گنبد کے اوپر چکر کاٹتی ہوئی چیلیں ہیں۔ عورتوں کا تعاقب کرتے ہوئے پھول بیچنے والے اور یتیم بچوں کے ہاتھ میں شام کی خبروں کے اخبار ہیں۔

۔۔۔اور تبھی چندر کو لگا کہ ایک عرصہ ہو گیا۔ ایک زمانہ گزر گیا۔ وہ خود اپنے سے نہیں مل پایا۔ اپنے سے باتیں کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ آخر تیرا حال چال کیا ہے اور تجھے کیا چاہیے؟ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی اور اُس نے ہر جمعہ کے آگے نوٹ کیا۔ خود سے ملنا ہے شام سات بجے سے نو بجے تک۔۔۔ اور آج بھی تو جمعہ ہی ہے۔ یہ ملاقات آج ہی ہونی چاہیے۔ گھڑی پر نظر جاتی ہے۔ سات بجا ہے۔ لیکن دل کا چور حاوی ہو جاتا ہے۔۔۔ کیوں نہ ٹی ہاؤس میں ایک پیالہ چائے پی لی جائے؟ نہ جانے کیوں دل اپنے سے ملنے میں گھبراتا ہے۔ رہ رہ کر کتراتا ہے۔

تبھی اُس پار سے آتا ہوا آنند نظر آتا ہے۔ وہ اُس سے بھی نہیں ملنا چاہتا۔ بڑا برا مرض ہے آنند کو۔ وہ اُس چھوت سے بچا رہنا چاہتا ہے۔ آنند دنیا میں دوست تلاش کرتا ہے۔ ایسے دوست جو زندگی میں گہرے نہ اتریں لیکن اُس کے ساتھ کچھ دیر رہ سکیں اور بات کر سکیں۔ اُس کی باتوں میں عجیب سا بناوٹی پن ہے۔ وہ بناوٹی پن جو آدمی کتابوں سے سیکھتا ہے اور اُس کو لگتا ہے کہ وہی بناوٹی پن خود اُس میں کہیں نہ کہیں ہے۔۔۔ جب کالج اور یونی ورسٹی کی کلاسوں میں بیٹھ بیٹھ کے وہ کتابوں سے زندگیوں کی مری ہوئی تفصیلات پڑھ رہا تھا۔ اور اب آج اُس کو لگتا ہے کہ وہ سارا وقت بڑی بے رحمی سے برباد کیا گیا ہے۔ اُس

نے اُن کھنڈروں میں وقت برباد کیا ہے جن کی داستانیں نیم تعلیم یافتہ گائیڈوں کی زبان پر رہتی ہیں جو ہر بار اُن مری ہوئی کہانیوں کو ہر ناظر کے سامنے دہراتے جاتے ہیں۔ یہ دیوان خاص ہے۔ ذرا نقاشی دیکھیے، یہاں ہیرے جواہرات سے جڑا تخت طاؤس تھا۔ یہ زنانہ حمام ہے اور یہ وہ جگہ ہے جہاں سے بادشاہ اپنی رعایا کو درشن دیتے تھے۔ یہ محل سردیوں کا ہے، یہ برسات کا اور یہ ہوادار محل گرمیوں کا اور ادھر آیئے سنبھل کے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پھانسی دی جاتی تھی۔

اور تب ہی ایک جوڑا اندر آتا ہے۔ عورت سجی بنی ہے اور جوڑے میں پھول بھی ہیں۔ آدمی کے چہرے پر عجیب سا غرور ہے اور دونوں فیملی والی سیٹ پر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ بیٹھنے سے پہلے اُن میں کوئی تعلق نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف اتنا بھر کہ جب عورت بیٹھنے کے لیے مڑی تھی تو ساتھ والے آدمی نے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر سہارا دیا تھا۔ اتنا سا ساتھ تھا دونوں میں۔

ان کے پاس بھی بات کرنے کے لیے شاید کچھ نہیں۔ عورت اپنا جوڑا ٹھیک کرتے ہوئے اوروں کو دیکھ رہی ہے اور ساتھ والا آدمی پانی کے گلاس کو دیکھ رہا ہے۔ کسی کو دیکھنے میں کوئی مطلب نہیں۔ آنکھیں ہیں اس لیے دیکھنا پڑتا ہے۔ اگر نہ ہوتیں تو سوال ہی نہ تھا۔ ایک جگہ دیکھتے دیکھتے آنکھوں میں پانی آجاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ادھر اُدھر دیکھا جائے۔

بیرا اُن کی میز پر سامان رکھ جاتا ہے اور دونوں کھانے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کوئی بات نہیں کرتا۔ آدمی کھا کر دانت کریدنے لگتا ہے اور وہ عورت رومال نکال کر انداز سے لپ اسٹک ٹھیک کرتی ہے۔ آخر میں بیرا آکر پیسے لوٹاتا ہے۔ آدمی کچھ ٹپ چھوڑتا ہے۔ جسے عورت غور سے دیکھتی ہے اور دونوں لاپروائی سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر اُن دونوں میں ہلکا سا سمبندھ اُسے نظر آتا ہے۔ وہ آدمی ٹھٹھک کر ساتھ والی عورت کو آگے نکلنے کا اشارہ کرتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے۔

چندر کا من اور بھاری ہو جاتا ہے۔ اکیلے پن کی گرفت اور بھی سخت ہو جاتی ہے۔ اپنے پاس بیٹھے ہوئے انجان دوست کی طرف وہ گہری نظروں سے دیکھتا ہے اور سوچتا ہے، اجنبی ہی سہی، لیکن اُس نے پہچانا تو ـــــ اتنی پہچان بھی بڑا سہارا دیتی ہے۔

چندر کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ ساتھ والا دوست کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن جیسے اُسے کچھ یاد نہیں آتا۔ پھر اپنے کو سنبھال کر اُس نے چندر سے پوچھا۔

"آپ تو شاید کامرس منسٹری میں ہیں؟ مجھے یاد آتا ہے کہ۔۔۔"

کہتے ہوئے رک جاتا ہے۔ چندر کا پورا بدن جھنجھنا اٹھتا ہے۔ اور ایک گھونٹ میں بچی ہوئی کافی پی کر وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں جواب دیتا ہے۔

"نہیں میں کامرس منسٹری میں کبھی نہیں تھا۔"

وہ آدمی اور قیاس کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ سیدھے سیدھے اُس انجان سمبندھ کو مضبوط بناتے ہوئے کہتا ہے ــــ

"آل رائٹ پارٹنر! پھر کبھی ملاقات ہوگی۔"

اور سگریٹ سلگاتا ہوا اُٹھ جاتا ہے۔

چندر باہر نکل کر بس اسٹاپ کی طرف بڑھتا ہے۔ مدراس ہوٹل کے پیچھے بس اسٹاپ پر چار پانچ آدمی کھڑے ہیں اور پولس والا اسٹاپ کی چھتری کے نیچے بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔ چندر وہیں آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سب جاننا چاہتے ہیں کہ بس کب تک آئے گی لیکن کوئی کسی سے کچھ نہیں پوچھتا۔ پیڑ کے اندھیرے میں وہ چپ چاپ کھڑا ہے۔ نیچے پیلے پتے پڑے ہیں جو اُس کے پیروں سے دب کر چُرمرانے لگتے ہیں اور پیلے پتوں کی وہ آواز اُسے برسوں پیچھے کھینچ لے جاتی ہے۔ اُس آواز میں ایک بہت گہرا پن ہے۔ اُسے بڑی راحت ملتی ہے۔

ایسے ہی پیلے پتے پڑے ہوئے تھے اُس راہ پر۔۔۔ بہت سال پہلے اندرا کے ساتھ ایک دن وہ چلا جا رہا تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا اُس کے سامنے۔ وہ کھنڈروں میں اپنی زندگی خراب کر رہا تھا اور تب اندرا ہی نے اُس سے کہا تھا ــــ

"چندر! تم کیا نہیں کر سکتے۔"

وہی پہچانی ہوئی آواز پھر اُس کے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ "تم کیا نہیں کر سکتے۔" اور یہ کہتے کہتے اندرا کی آنکھوں میں بے پناہ یقین جھلک آیا تھا۔ اندرا کی اُن پیار بھری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔

"میرے پاس ہے ہی کیا؟ سمجھ میں نہیں آتا زندگی کہاں لے جائے گی اندرا؟ اس

لیے میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی زندگی میری خاطر بگاڑ لو۔ پتہ نہیں کس کنارے لگوں، مجبور مروں کہ پاگل ہو جاؤں ــــ "

اندرا کی آنکھوں میں پیار کے بادل اور گہرے ہو گئے تھے اور اُس نے کہا تھا ــــ

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو چندر؟ میں تمھارے ساتھ ہر حال میں سکھی رہوں گی۔"

چندر نے اُسے بہت غور سے دیکھا تھا۔ اندرا کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ اُس کی کٹیلی آنکھوں سے وشواس بھری معصومیت چھلک رہی تھی۔ ماتھے پر آئی ہوئی لٹ چھونے کو اُس کا دل چاہنے لگا تھا۔ پھر وہ جھجک کر رہ گیا تھا۔

اندرا کے کانوں میں پڑے ہوئے کنڈل پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کی طرح چھلک جاتے تھے اور تب اس نے کہا تھا ــــ

"آؤ ادھر پیڑ کے نیچے بیٹھیں گے۔"

وہ دونوں ساتھ ساتھ چل دیے تھے۔ سریس کے پیڑ کے نیچے ایک سمنٹ کی بینچ بنی تھی۔ راہ پر پیلی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اُن کے کچلنے سے ایسی ہی آواز آئی تھی جیسے اُس نے ابھی ابھی سنی تھی ــــ وہی پہچان بھری آواز۔

دونوں بینچ پر بیٹھ گئے تھے اور چندر دھیرے سے اُس کی کلائی پر لکیریں کھینچنے لگا تھا۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے، بہت سی باتیں تھیں، جو وہ کہہ نہیں پا رہے تھے۔ کچھ لمحہ بعد اندرا نے آنکھیں چراتے ہوئے اُسے دیکھا تھا اور شرما گئی تھی، پھر اس بات پر آ گئی تھی، جیسے اُسی ایک بات میں ساری باتیں چھپی ہوں۔

"تم ایسا کیوں سوچتے ہو چندر؟ مجھ پر بھروسہ؟"

تب چندر نے کہا تھا ــــ

"بھروسہ تو بہت ہے اندرا، پر میں خانہ بدوشوں کی طرح زندگی بھر بھٹکتا رہوں گا اِن پریشانیوں میں تمھیں کھینچنے کی بات سوچتا ہوں تو برداشت نہیں کر پاتا۔ تم بہت اچھی اور پُر آسائش زندگی گزار سکتی ہو۔ میں نے تو سر پر کفن باندھا ہے۔ میرا کیا ٹھکانہ؟"

تم چاہے جو کچھ بنو چندر، اچھے یا برے، میرے لیے ایک سے رہو گے۔ کتنا انتظار کرتی ہوں تمھارا۔ پر تمھیں کبھی وقت ہی نہیں ملتا۔ پھر کچھ دیر خاموش رہ کر اُس نے پوچھا ــــ "اِدھر کچھ لکھا ہے؟"

"ہاں۔" آہستہ سے چندر نے کہا تھا۔

"دکھاؤ"! اندرا نے مطالبہ کیا تھا۔

اور تب چندر نے پسیجے ہوئے ہاتھوں سے ڈائری بڑھا دی تھی۔ اندرا نے فوراً اس ڈائری کو اپنی کتابوں میں رکھ لیا تھا اور بولی تھی، "اب یہ کل ملے گی۔ اس بہانے تو اب آؤ گے۔"

"نہیں نہیں۔ میں ڈائری اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ مجھے واپس دو۔" چندر نے کہا تھا تو اندرا شیطانی سے مسکراتی رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں پیار کی گہرائیاں بڑھ گئی تھیں۔ ہار کر چندر واپس چلا آیا تھا۔ اور دوسرے دن اپنی ڈائری لینے پہنچا تھا۔ اندرا نے کہا تھا، "اس میں کچھ میں نے بھی لکھا ہے، پڑھ کر پھاڑ دینا ضرور اسے۔"

"میں نہیں پھاڑوں گا۔"

"تو کٹی ہو جائے گی۔" اندرا نے بڑی معصومیت سے کہا تھا۔ اور اُس وقت اُس کے منہ سے وہ بے حد بچپنے کی بات بھی بڑی اچھی لگی تھی۔

اور ایک دن۔۔۔

ایک دن اندرا گھر آئی تھی۔ اِدھر اُدھر سے گھوم گھام کر وہ چندر کے کمرے میں پہنچ گئی تھی۔ تب چندر نے پہلی بار اُس کو بالکل اپنے پاس محسوس کیا تھا۔ اُس کے ماتھے پر رنگ سے بندی بنا دی تھی۔ اور کتنی دیر تک بے خود بنا اُسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اور انجانے میں اُس نے ہونٹ اندرا کی پیشانی پر رکھ دیے تھے۔ اندرا کی پلکیں بند ہو گئی تھیں اور اُس کے روئیں روئیں سے خوشبو پھوٹ اٹھی تھی۔ اُس کی انگلیاں چندر کی بانہوں پر تھر تھرانے لگی تھیں اور ماتھے پر آیا پسینہ اُس کے ہونٹوں نے جذب کر لیا تھا۔ ریشمی روئیں پسینے سے چپک گئی تھیں اور کیف کے ان لمحوں میں دونوں نے عہد کیا تھا ــــــ وہ عہد جس میں الفاظ نہیں تھے اور ہونٹوں تک بھی نہیں آیا تھا۔ تب سے اسے یہ الفاظ ہمیشہ یاد رہتے ہیں ــــــ "تم کیا نہیں کر سکتے؟"

اور تبھی ایک دوسرے نمبر کی بس آتی ہے اور ٹھٹھک کر چلی جاتی ہے۔ چندر کو احساس ہوتا ہے کہ وہ بس اسٹاپ پر کھڑا ہے، وہ گہری پہچان ــــــ کہیں کوئی تو ہے۔ اور وہ

بہت دور بھی تو نہیں۔

اندرا بھی تو یہیں ہے دلّی میں۔

دو مہینے پہلے ہی تو وہ ملا تھا۔ تب بھی اندرا کی آنکھوں میں وہی چار برس پہلے کی پہچان تھی اور اپنے پتی سے کسی بات پر کہا تھا ــــ "ارے چندر کی عادتیں میں خوب جانتی ہوں۔"

اور اندرا کے پتی نے کھلے دل سے کہا تھا، "تو بھائی ان کی خاطر واطر کرو۔"

اور اندرا نے مسکراتے ہوئے چار برس پہلے کی طرح چڑھانے کے انداز میں کہا تھا، "چندر کو دودھ سے چڑ ہے اور کافی انھیں دھواں پینے کی طرح لگتی ہے، چائے میں اگر دوسرا چمچ چینی ڈال دی جائے تو ان کا گلا خراب ہو جائے گا۔" کہہ کر وہ کھل کھلا کر ہنس دی اور اس بات سے اس نے پچھلی باتوں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ سچ مچ چندر دو چمچ چینی نہیں پی سکتا۔ بس آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

کھڑے کھڑے چندر کو لگا کہ اس انجانی اور بغیر جان پہچان سے بھری نگری میں ایک اندرا ہے جو اتنے سالوں کے بعد بھی پہچانتی ہے، اب تک جانتی ہے۔ اس کا جی اندرا سے ملنے کے لیے چاہنے لگا تاکہ یہ اجنبیت کسی طرح ختم نہ ہو۔

تبھی ایک پھٹ پھٹ والا آواز لگاتا ہوا آتا ہے، "گردوارہ روڈ، قرول باغ، گردوارہ روڈ۔" چندر ایک دم آگے بڑھتا ہے اور وہ سردار کو دیکھتے ہی جیسے ایک دم پہچان جاتا ہے۔ "آیئے بابو جی قرول باغ، گردوارہ روڈ۔" اُس کی آنکھوں میں پہچان کی جھلک دیکھ کر چندر کا من ہلکا ہو جاتا ہے۔ آخر ایک نے تو پہچانا۔ چندر سردار کو پہچانتا ہے۔ بہت بار وہ اسی سردار کی پھٹ پھٹ میں بیٹھ کر کناٹ پلیس آیا ہے۔

آنکھوں میں پہچان دیکھتے ہی چندر پلٹ کر پھٹ پھٹ پر بیٹھ جاتا ہے۔ تین سواریاں اور آجاتی ہیں۔ اور دس منٹ بعد ہی گردوارہ روڈ کے چوراہے پر پھٹ پھٹ رکتا ہے۔ چندر ایک چونی نکال کر سردار کی ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے اور پہچان بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے چلنے لگتا ہے۔

تبھی پیچھے سے آواز آتی ہے، "اے بابو جی، کتنا پیسہ دیا ہے؟" چندر مڑ کر دیکھتا ہے تو سردار اس کی طرف آتا ہوا کہتا ہے ـــ "دو آنے اور دیجئے صاحب۔"

"ہمیشہ چار آنے لگتے ہیں سردار جی۔" چندر پہچان جتاتے ہوئے کہتا ہے۔ پر سردار کی آنکھوں میں پہچان کی پرچھائیں تک نہیں۔ وہ پھر کہتا ہے۔۔۔ "سردار جی آپ کی پھٹ پھٹ پر ہی بیسیوں بار چار آنے دے کر آیا ہوں۔"

"کسی ہور نے لیے ہوں گے چار آنے۔ اسی نے چھ آنے توں گھٹ نئیں لندے بادشاہو۔" سردار اس بار پنجابی میں بولا تھا۔ اور اُس کی ہتھیلی پھیلی ہوئی تھی۔ بات دو آنے کی نہیں تھی، چندر نے باقی پیسے اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیے اور اندرا کے گھر کی طرف مڑ گیا۔ اور اندرا اُس سے ملی تو ویسے ہی۔ وہ اپنے پتی کا انتظار کر رہی تھی۔ بڑی اچھی طرح اس نے چندر کو بٹھایا اور بولی، "اِدھر کیسے بھول پڑے آپ؟" پھر آنکھوں میں وہی پہچان کی پرچھائیں تیر گئی تھیں۔ چند لمحے بعد اندرا نے کہا تھا، "اب تو نو بج رہے ہیں۔ یہ آٹھ ہی بجے فیکٹری بند کر کے لوٹ آتے ہیں۔ پتہ نہیں آج کیوں دیر ہو گئی۔ اچھا چائے پیو گے؟"

"چائے کے لیے انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔" چندر نے بڑی امنگ سے کہا تھا اور کرسی پر آرام سے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا تھا۔ اُس کی ساری تھکن اتر گئی تھی۔ من کا اکیلا پن ڈوب گیا تھا۔

نوکرانی آکر چائے رکھ گئی تھی۔ اندرا نے پیالے سیدھے کر کے چائے بنائی تو وہ اس کی بانہوں، چہرے اور ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔۔۔ ویسا ہی تھا جانا پہچانا۔ تبھی اندرا نے پوچھا، "چینی کتنی دوں؟"

ایک جھٹکے سے سب کچھ بکھر گیا۔ اس کا گلا خشک سا ہونے لگا۔ اور جسم پھر تھکن سے بوجھل ہو گیا۔ ماتھے پر پسینہ آگیا۔ پھر بھی اُس نے پہچان کا رشتہ جوڑنے کی ایک ناکام کوشش کی اور بولا، "دو چمچ ــــ" اور اسے لگا کہ ابھی اندرا کو سب کچھ یاد آجائے گا، وہ کہے گی کہ "دو چمچ چینی سے گلا خراب نہیں ہوتا؟"

پر اندرا نے پیالے میں دو چمچ چینی ڈال دی اور پیالہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ زہر کے گھونٹوں کی طرح وہ چائے پیتا رہا۔ اندرا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی مگر اُن میں اُسے مہمان نوازی کی بو لگ رہی تھی! اور چندر کا جی چاہ رہا تھا کہ اندرا کے پاس سے کسی بھی طرح بھاگ جائے۔ اور کسی دیوار سے اپنا سر ٹکرا لے۔

جیسے تیسے اُس نے چائے پی اور پسینہ پونچھتا ہوا باہر نکلا۔ اندرا نے کیا کیا باتیں

نہیں۔ اسے بالکل یاد نہیں۔ سڑک پر نکل وہ ایک گہری سانس لیتا ہے۔ اور کچھ دیر کے لیے کھڑا رہ جاتا ہے اُس کا گلا بری طرح خشک ہو رہا ہے اور منہ کا مزا بے حد بگڑا ہوا ہے۔

چوراہے پر کچھ ٹیکسی ڈرائیور نشے میں گالیاں بک رہے ہیں اور ایک کتا دور سڑک پر بھاگا جا رہا ہے۔ مچھلیاں تلنے کی مہک یہاں تک آ رہی ہے اور پان والے کی دکان پر کچھ جوان لوگ کوکا کولا کی بوتلیں منہ میں لگائے کھڑے ہیں۔ اسکوٹروں میں کچھ لوگ بھاگے جا رہے ہیں اور شہر سے دور جانے والے لوگ بس اسٹاپ پر اب بھی انتظار میں کھڑے ہیں۔ کاریں ٹیکسیاں، بسیں اور اسکوٹر آ جا رہے ہیں۔ چوراہے پر لگی بتیوں کی آنکھیں اب بھی لال پیلی ہو رہی ہیں۔

چندر تھکا سا اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا ہے۔ ایڑیوں پر جوتا کاٹ رہا ہے اور موزے کی بدبو اور بھی تیز ہو گئی ہے۔

آخر وہ تھکا ماندہ گھر پہنچتا ہے اور مہمان کی طرح کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نرملا اس کو دیکھ کر مسکراتی ہے اور دھیرے سے بانہوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھتی ہے۔

"بہت تھک گئے؟"

"ہاں!" چندر کہتا ہے اور اُس کو بہت پیار سے دیکھتا ہے۔ اُس کا من اندر سے اٹھ آتا ہے۔ وہ کرائے کا مکان بھی اس لیے اُس کو راحت دیتا ہے اور یوں معلوم دیتا ہے جیسے وہ اسی کا ہو۔

نرملا کھانے لگاتے ہوئے کہتی ہے "ہاتھ منہ دھو لو۔۔۔۔"

"ابھی کھانے کا جی نہیں ہے۔" چندر کہتا ہے تو وہ بہت پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھتی ہے، "کیوں کیا بات ہے؟ صبح بھی تو کھا کے نہیں گئے تھے۔ دوپہر میں کچھ کھایا تھا؟"

"ہاں!" وہ کہتا ہے اور نرملا کو دیکھتا رہ جاتا ہے۔

نرملا کچھ ہچکچاتی ہے اور کچھ دیر بعد تھکی سی اُس کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔

چندر کچھ کھوئی کھوئی نظروں سے کمرے کی ہر چیز کو دیکھتا رہتا ہے اور بیچ بیچ میں بڑی گہری نظروں سے نرملا کو تاکتا ہے۔ نرملا کوئی کتاب کھول کر پڑھنے لگتی ہے اور چندر اُس کو تکے جا رہا ہے۔

پیچھے پڑتی ہوئی روشنی میں نرملا کے بال ریشم کی طرح چمک رہے ہیں۔ اُس کی پلکیں ملائم کانٹوں کی طرح لگ رہی ہیں اور کنپٹی کے قریب ریشمی بالوں کے سرے اپنے آپ گھوم گئے ہیں۔ پلک کے نیچے پڑتی ہوئی پرچھائیں بہت پہچانی سی لگ رہی ہے۔ اُس نے کڑا آدھی کلائی تک سرکالیا ہے۔

چندر کی نگاہیں اُس کے اعصاب میں پرانی پہچان تلاش کر رہی ہیں۔ اُس کے ناخنوں، انگلیوں اور کانوں کی گداز لویں۔

اٹھ کر وہ پردہ کھینچ دیتا ہے اور آرام سے لیٹ جاتا ہے۔ اُس کو لگتا ہے جیسے وہ اکیلا نہیں ہے۔ اجنبی اور تنہا نہیں ہے۔ سامنے والا گلدستہ اُس کا اپنا ہے۔ پڑے ہوئے کپڑے اُس کے اپنے ہیں۔ اُن کی خوشبو وہ پہچانتا ہے۔

ان سبھی چیزوں میں ایک گہری پہچان ہے۔ اندھیری رات میں بھی وہ انھیں ٹٹول کر پہچان سکتا ہے۔ کسی بھی دروازے سے بغیر ٹکرائے نکل سکتا ہے۔

--- تبھی زینہ پر گلائی کے تھکے قدموں کی کھوکھلی آہٹ سنائی پڑتی ہے اور اُس کو گھبراہٹ سی ہوتی ہے۔ وہ دھیرے سے نرملا کو اپنے قریب بلاتا ہے اُسے لٹا کر چھاتی پر اپنا ہاتھ رکھ لیتا ہے۔

کچھ لمحوں تک وہ اُس کی سانس سے زیر و بم ہوتی چھاتی کو محسوس کرتا ہے---اور چاہتا ہے کہ نرملا کے بدن کا انگ انگ اور دل کی ہر دھڑکن اس کو پہچان کی گواہی دے--- گہرے خلوص اور تعلقات کا احساس دے۔

تاریکی ہی میں وہ اُس کے ناخنوں کو ٹٹولتا ہے۔ اُس کی پلکوں کو چھوتا ہے۔ اُس کی گردن میں منہ چھپا کر کھو جانا چاہتا ہے۔ دھلے ہوئے بالوں کی جانی پہچانی خوشبو اُس کے روئیں روئیں میں رسنے لگتی ہے اور اُس کے ہاتھ پہچان کے لیے پور پور پر تھرتھراتے ہوئے سرکتے ہیں۔ نرملا کی سانس بھاری ہو آتی ہے۔

وہ اُس کی گداز بانہوں کو محسوس کرتا ہے اور گول گول گداز شانوں پر ہاتھ سے تھپتھپاتا رہتا ہے۔ نرملا کے بدن کا انگ انگ انوکھی محبت سے کھنچا سا آتا ہے۔ اُس کا رواں رواں اُس کو پہچان رہا تھا۔ جوڑ جوڑ شدید گرفت سے جکڑا ہوا تھا۔ تن کے اندر گرم خون کے جوار اٹھ رہے تھے اور ہر سانس تازگی کھینچتی جا رہی تھی۔ اعصاب اور انگلیوں کے پور پور میں

ایک گہری پہچان تھی۔

تبھی بشن کپور کی کھڑکی میں اجالا ہوتا ہے اور دھواں سلاخوں سے لپٹ لپٹ کے گلی کی تاریکی میں ڈوبنے لگتا ہے۔

اور اُس کا تنہا من تنہائیوں کو چھوڑ کے اُس جانی پہچانی خوشبو جانے پہچانے سانسوں اور پہچانے لمسوں میں ڈوبتا جاتا ہے۔ اُس کو اور کچھ بھی نہیں چاہیے۔۔۔ جان پہچان کا ایک مطالبہ ہے اور اُس تاریکی میں وہ سانس سے خوشبو سے تن کے ٹکڑے ٹکڑے سے پہچان چاہتا ہے۔

چاروں طرف سناٹا طاری ہے۔

اور اُس خاموشی میں وہ مطمئن ہوتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اُس کو بھر لیتا ہے۔ جوار در اٹھتا ہے۔ بدن کی گرمی اور بڑھتی ہے اور روئیں روئیں میں ملاپ کا ساگر لہرانے لگتا ہے۔

آہستہ آہستہ نرملا کی تیز سانسیں دھیمی پڑتی ہیں اور مقناطیسی کشش ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ کھنچاؤ ٹوٹنے لگتا ہے اور اعصاب کے جوار اترنے لگتے ہیں۔۔۔

چندر کس کے اُس کی بانہوں کو جکڑے رہتا ہے۔۔۔ اترتا ہوا جوار اُس کو پھر اکیلا چھوڑے جا رہا ہے۔۔۔ انجان کناروں پر چھوڑی ہوئی سیپی کی مانند۔

نرملا اپنی دبی ہوئی بانہہ نکال لیتی ہے اور گہری سانس لے کر ڈھیلی سی لیٹ جاتی ہے۔

دھیرے دھیرے سب کچھ سو جاتا ہے اور رات بہت نیچے اتر آتی ہے۔ کہیں کوئی آواز نہیں۔ کوئی آہٹ نہیں۔

آہستہ سے نرملا کروٹ بدلتی ہے اور دوسری طرف منہ کر کے گہری نیند میں ڈوب جاتی ہے۔

کروٹ بدل کے لیٹی ہوئی نرملا کو وہ کاہلی سے دیکھتا رہتا ہے۔۔۔

اور چندر پھر اپنے کو بے حد اکیلا محسوس کرتا ہے۔۔۔ وہ نرملا کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ چاہتا ہے کہ اس کی کروٹ بدل دے۔ لیکن اس کی انگلیاں بے جان ہو کر رہ جاتی ہیں۔ کچھ لمحہ وہ تاریکی میں ہی نرملا کو ادھر منہ کیے لیٹا ہوا دیکھتا ہے اور مایوس سا خود بھی لیٹ

جاتا ہے۔ معلوم نہیں کب اس کی پلکیں جھپ جاتی ہیں۔

اور پھر بہت دیر بعد تھانے کا گھڑیال دو کے گھنٹے بجاتا ہے اور اُس کی نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ نیند کے خمار میں ہی وہ چونک سا پڑتا ہے۔ کمرے کی خاموشی اور ویرانی سے اُس کو ڈر سا لگتا ہے۔ تاریکی میں ہی وہ نرملا کو ٹٹولتا ہے۔ تکیے پر بکھرے اُس کے بالوں پر اُس کا ہاتھ پڑتا ہے اور وہ اُن بالوں کی چکنائی کو محسوس کرتا ہے۔ سر جھکا کے وہ انھیں سونگھتا ہے۔۔۔

پھر وہ نرملا پر ہاتھ رکھتا ہے۔ اُس کے گول شانوں کو چھوتا ہے وہ لمس بھی پہچانا ہوا ہے۔۔۔ آہستہ آہستہ وہ اُس کے پورے بدن کو پہچاننے کے لیے ٹٹولتا ہے اور اُس کے سانسوں کی ہلکی آواز کو سننے اور پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔

نرملا اب بھی کروٹ لیے پڑی تھی، وہ دھیرے سے کسمساتی ہے۔ چندر کا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ کہیں نرملا جاگ نہ جائے۔ انجانے میں ہی اُس لمس سے اجنبیوں کی طرح چونک نہ جائے۔

نرملا سوتے سوتے ایک مرتبہ رک رک کر سانس لیتی ہے جیسے اُس کو ڈر سا لگ رہا ہو۔۔۔ یا کوئی خوفناک خواب دیکھ رہی ہو۔۔۔ چندرن سا رہ جاتا ہے۔۔۔ کیا وہ اُس کے لمس کو نہیں پہچانتی؟

اور پھر وہ نرملا کو جھنجھوڑ کے اٹھاتا ہے، "نرملا۔۔۔ نرملا،" وہ بدحواسی میں کہتا ہے۔

نرملا چونک کر اٹھتی ہے اور آنکھیں ملتے ہوئے کھڑے ہونے کی کوشش کرتی ہے۔

اور بجلی جلا کر وہ نرملا کو دونوں کندھوں سے پکڑ کے اپنا منہ اُس کے سامنے کر کے ڈری ہوئی آواز میں پوچھتا ہے۔

"مجھے پہچانتی ہو؟ مجھے پہچانتی ہو نرملا؟"

نرملا آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہ جاتی ہے۔ دھیرے سے، حیرانی بھرے لہجہ میں کہتی ہے، "کیا ہوا؟"

اور وہ نرملا کو تکتا رہ جاتا ہے۔ اُس کی آنکھیں اُس کے چہرے پر کچھ تلاش کرتی رہ جاتی ہیں۔

نیلی جھیل

بہت دور سے ہی وہ نیلی جھیل نظر آنے لگتی ہے، سپاٹ میدانوں کے کنارے پر درختوں کے جھرمٹ کے عقب میں ایسا معلوم پڑتا ہے جیسے دھرتی ایک دم ڈھلان ہو کر چھپ گئی ہو۔
لیکن بغور دیکھنے پر اونچے اونچے درختوں کے درمیان سے ایک بہت بڑا شیشہ نظر پڑتا ہے۔

یہی وہ جھیل ہے۔

اور اسی جھیل پر آبی پرندوں کے شکار کے لیے آئے ہوئے انگریز کلکٹر نے کہا تھا، "کتنی خوبصورت ہے یہ جھیل! جیسے زمین میں ہیرا جڑا ہو۔۔۔ جھیل تک پہنچنے کے لیے پکا راستہ ہونا چاہیے۔"

یہ تیس سال پہلے کی بات ہے۔

اور تب بستی سے جھیل تک راستہ بنانے کے لیے آئے ہوئے مزدوروں کی ٹولی میں وہ بھی آیا تھا۔ اور انگریز صاحب کی میم کی آنکھوں کو دیکھ کر اُس نے کہا تھا، "کتنی خوبصورت ہے میم! اُس کی آنکھیں نیلی جھیل کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔"

بگڑے اور بد صورت مزدوروں نے تب آنکھیں بچا کر گندے اشارے کیے تھے اور گیلی بھیگی زمین میں کار کے پہیے پھنستے ہی وہ سب سے پہلے دوڑ کر اُس جانب دھکا لگانے کے لیے جٹ گیا تھا جدھر میم بیٹھی تھی۔۔۔ اُس کا دل چاہا کہ بہانے سے ہاتھ بڑھا کر پھول سی میم کو چھو لے لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی اور مزدوروں کو اُس کی اس سینہ زوری پر بڑا غصہ آیا تھا اور وہ جی ہی جی میں چاہتے تھے کہ اس کی مرمت ہو جائے۔

رات کو جب درخت تلے اکٹھی کی ہوئی لکڑیوں کے سانجھے چولہے جلے اور اس ویرانے میں مزدوروں کے چہرے آگ کی لو میں شیطانوں کی طرح چمکنے لگے تھے تو بھجو نے بغل سے تمباکو کا بٹوا نکالتے ہوئے کہا۔

"اس سالے کو میٹ سے کہہ کر نکلوالیا جائے۔ میم جان جاتی تو کھال کھینچ لیتی!۔۔۔ سالا آسک بنتا ہے!"

"بننے دو تمھارا کا لیتا ہے؟" بھوک سے بے چین اور جلدی جلدی باٹیاں سینکتے ہوئے ہوری نے بات کاٹ دینی چاہی۔

"ہم سب کی روزی جائے گی،" آگ کریدتے ہوئے ایک اور مزدور نے کہا۔

تبھی دوسرے درخت تلے سے بڑی بھدی اور موٹی آواز میں ایک گیت کا بول ابھرا۔

"ہوئے میمیا توری انگیا بڑو جلم ڈھایو ری۔۔۔"

اور پیتل کی تھالی ٹھنک اٹھی، مہیسا شیطان کی طرح ناچ رہا تھا۔ باٹیاں پکاتے ساتھیوں کی ہنسی اور واہ واہ سے شور مچ گیا تھا۔ بھوکے اور تھکے مزدوروں کی آنکھوں میں ایک وحشی چمک آگئی تھی اور ایک لحہ کے لیے جیسے بدن کا درد بھول گئے تھے۔ مہیسا گا گا کر کچھ دیر ناچتا رہا۔۔۔ درختوں کی پتیاں آگ کی دمک میں تانبے کی طرح معلوم ہو رہی تھیں اور ان کے کالے پوپلے دار تنے اژدہوں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ آسمان سیپ کی پیٹھ کی طرح دھندلا اور کالا تھا اور جھیل کی جانب سے عجیب طرح کی سونی سونی آوازیں آرہی تھیں۔

اسی وقت ایک تیز آواز میں چیختا ہوا ایک سارس گزر گیا۔ اس کے بڑے بڑے پروں سے آہیں سی نکل رہی تھیں۔ سارس کی چیخ کی بازگشت کچھ لمحے تک آتی رہی اور مہیسا کا سوانگ رک گیا۔

"اب سیدھا ہو کر بیٹھ روٹی کھالے،" کانے میٹ کی آواز تھی یہ۔

ناراض ساتھیوں کو میٹ کا اس طرح اپنے پن سے بولنا اچھا نہیں معلوم ہوا۔ بھجو نے آہستہ سے کہا بدمعاش نے میٹ کو خوش کر لیا ہے۔

"کانا بھی ٹھیک ہے نا۔ اسے بھی مجا آتا ہے۔"

گو بھی دار باٹیاں اور ارد کی پکی ہوئی دال کی مہک سے سب کی بھوک چمک اٹھی

تھی۔ دیر تک باتوں کے درمیان کھانا چلتا رہا۔ آہستہ آہستہ چولہوں کی آگ راکھ میں دب گئی اور درختوں کا اندھیرا گہرا ہو گیا۔

صبح کام شروع ہوتے ہی سیاحوں کی ایک پارٹی وہاں آکر رک گئی۔ کچھ ہندوستانی صاحب تھے اور ساتھ میں کچھ اچھی اچھی عورتیں۔ عورتوں کے شانوں پر کیمرے لٹک رہے تھے اور صاحبوں کے کندھوں پر ایرگن اور کارتوس کی پیٹیاں۔ کھانے پینے کا سامان کانڈیوں میں تھا اور وہ بوجھ ان سے چل نہیں رہا تھا۔ عورتوں کے خوبصورت چہرے پسینہ سے شرابور تھے۔ اور ساڑیوں کے پلو کمر میں گھسے ہوئے تھے۔ دھول سے بچانے کے لیے ساڑیاں ایک طرف سے کچھ اونچی کرلی گئی تھیں۔ اُنھیں دیکھتے ہی مزدوروں نے رکنے کا مطلب بھانپ لیا تھا اور وہ اپنے کام میں اتنے مشغول ہو گئے تھے کہ جیسے اُن لوگوں کی موجودگی کا انھیں احساس ہی نہ ہو۔ لیکن مہیسا ہاتھ روک کر چھینتا کنے کے بہانے کنکھیوں سے انھیں تاک رہا تھا۔ وہ اسی انتظار میں معلوم ہو رہا تھا کہ ابھی ان میں کوئی عورت سامان اٹھانے کے لیے کہے گی اور وہ میٹ کی مرضی دیکھ کر یقیناً اس کی مدد کے لیے تیار ہو جائے گا۔

صاحب لوگ بھی کسی مزدور سے آنکھیں ملانے کی تاڑ میں تھے۔ مزدور سب آنکھ بچا رہے تھے۔ بس مہیسا آنکھ ملانے کے لیے اتاؤلا تھا لیکن صاحبوں سے نہیں۔ جیسے اس نے یہی طے کیا تھا کہ نیلی ساڑی والی عورت اگر کہے گی تو وہ پھاوڑا چھوڑ کر سامان اٹھالے گا۔ وہ بار بار اس کو ہی حیرت سے تاک رہا تھا کہ نیلی ساڑی والی عورت نے موقع پاکر بڑی میٹھی آواز میں کہا تھا، "کوئی مزدور مل جائے گا یہاں پر؟"

مہیسا کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ مزدور ہی چاہتی ہے تو تلاش کرلے۔ اس نے ٹھسک سے کہا، "ہم لوگ سرکاری گینگ کے آدمی ہیں۔" کچھ اس طرح جیسے سرکار سے روپیہ پاکر مزدوری کرنا کچھ اونچی بات ہو۔

"ارے ذرا سی مدد چاہیے ـــ یہ سامان جھیل تک پہنچانا ہے۔" اُسی نیلی ساڑی والی کی میٹھی آواز تھی۔

مہیسا کا دل بہک اٹھا۔ بڑے پن اور شان سے بولا، "مدد مل سکتی ہے ایسے بولیے۔"

مہیسا کے حقیر سے فخر کی جانب اشارہ کرکے وہ آہستہ سے ہنسی اور مہیسا ایک لمحہ کے لیے ٹکٹکی لگائے اُس کے صاف دانتوں کو دیکھتا رہا۔ پھر دوڑ کر میٹ کے پاس پہنچا اور

سامان اٹھانے کی اجازت مانگ کر چلا آیا۔

آتے ہی اُس نے فخر سے ان کا سامان اٹھایا اور نیلی ساڑی والی کے شانے میں لٹکے تھرمس کو مانگنے کے بہانے سے بولا، "یہ بوتل بھی دیدیجئے۔"

میٹھی آواز والی عورت نے کچھ جواب نہیں دیا لیکن وہ ایسے ماننے والا نہیں تھا۔ چلتے چلتے اس نے پھر پوچھا، "آپ لوگ شکار کے لیے آئے ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں۔"

لیکن وہ نیلی ساڑی والی عورت ایک آدمی سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ مہیسا کو یہ بھلا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک عجیب طرح کی پریشانی اُس کو ہو رہی تھی۔ کچھ دور تو اس نے برداشت کیا پھر اُس کا جی چاہا کہ سامان پٹک کر اس آدمی سے کہے کہ اٹھائیے اپنا تام جھام! میں مجبور نہیں ہوں! لیکن اس کے ساتھ چل سکنا بھی اس کو کم بھلا نہیں لگ رہا تھا۔۔۔ اُس کو بولنے کا پھر موقع ملا۔ غلط راستے پر مڑتے دیکھ کر وہ لپک کر نیلی ساڑی والی کے پاس پہنچا اور ایک دم اس کی ناواقفیت پر جیسے چیخ پڑا، "آپ لوگوں کو راستہ نہیں معلوم۔ ہمارے ساتھ آیئے۔ ادھر سے دلدل پڑے گا۔"

"دلدل! اوہ!" نیلی ساڑی والی کچھ زیادہ چونک گئی اس کا یہ چونکنا مہیسا کو بہت اچھا معلوم ہوا۔ اس کو ناقابل بیان سکھ سا ملا تھا۔۔۔ کانپور میں مل سے چھٹی پاتے ہی وہ چوراہے والے کونے پر رک کر اس طرح عورتوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔

جھرمٹ کے قریب پہنچتے ہی سب لوگ رک گئے۔ سامان وہیں اتروالیا گیا۔ سبھی عورتیں ہوا کی ٹھنڈک میں اپنے بالوں کی لٹیں اوپر کرتی ہوئی یا ساڑیاں سنبھالتی ہوئی بے فکری سے بیٹھ گئیں۔

ہلکی ہلکی ہوا جھیل کی جانب سے آ رہی تھی اور سایہ میں کچھ خنکی بھی تھی۔ جھیل کے پانی کے اندر بادل تیر رہے تھے اور نرکل آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے۔۔۔ دور سے جدھر سے پانی اتھلا تھا۔ دیوہنسوں، مرغابیوں اور پتاری کے جھنڈوں کے چیخنے اور پر پھڑپھڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دیوہنس شاید آبی تنکے کھا رہے تھے اور مرغابی گھونگھے اور کیکڑے ڈھونڈنے میں مشغول تھے۔ درختوں پر چڑیاں چہک رہی تھیں۔

اچانک نیلی ساڑی والی نے جھیل کے پانی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے حیرت سے کہا، "پانی کا سانپ سا تیر رہا ہے۔"

سبھی اشتیاق سے دیکھنے لگے۔ مہیسا کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ کیسے سمجھائے۔ ان صاحبوں کو وہ اتنا بھی نہیں جانتے! وہ صرف نیلی ساڑی والی کو ہی بتانا چاہتا تھا۔ ایک دم بولا،

"پانی کا سانپ نہیں ہے ایک چڑیا ہے وہ!"

"چڑیا؟ بکتا ہے۔" نیلی ساڑی نے پیار سے کہا۔

"نہ مانیں تو دیکھتی رہیں۔" پھر ادھر اُدھر نظر دوڑا کر بولا۔ "وہ اُس پانی میں ٹھونٹھ کو دیکھ رہی ہے؟ وہ۔۔۔اس پر جو کالی چڑیا بیٹھی ہے اُس کا ساتھی یہ سرپ پا کھی۔"

"وہ کالی چڑیا؟" وہ نیلی ساڑی والی اس سے بات کر رہی تھی اور وہ دل لگا کر اس کو بتا رہا تھا، "ہاں! ہاں! وہی سرپ پاکھی تیرنے کا بہت شوقین ہوتا ہے۔ بس بھالے سے کالی چونچ نکال کر تیرتا رہتا ہے۔"

"کھاتا کیا ہے؟" اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"مچھلی۔" اُس کی آنکھوں میں چمک آتی جا رہی تھی۔ بات جاری رکھنے کے لیے اس نے بات جڑ دی۔ "ابھی جب تھک جائے گا تو کسی ٹھونٹھ پر پَر اور دُم پھیلا کر سکھائے گا۔"

"ابھی نکلے گا؟" نیلی ساڑی والی کا منہ کھلا رہ گیا۔

اور اُس کے سفید دانتوں کو مہیسا تاکتا رہا۔ کنوا کے سفید پروں کی طرح دھلے ہوئے، چمکدار! اُس کا جی جانے کو نہیں ہو رہا تھا لیکن میٹ نے کہا تھا جلدی لوٹنا اور پھر ساتھیوں کے کلیجے پر سانپ لوٹ رہا ہوگا۔

تبھی ایک صاحب کو بندوق سنبھالتے ہوئے دیکھ کر اُس کا جی اچاٹ ہو گیا۔ وہ ساڑی والی بھی اب بندوق کی طرف زیادہ توجہ دے رہی تھی۔

اُن کے ساتھ کے ایک صاحب نے اُس کو کچھ پیسے دیے اور ابھی ایک لمحہ قبل کا مہیسا اپنی ساری دلچسپی بھول کر چل پڑا اُس کا من بھاری ہو آیا تھا۔ رہ رہ کر اس کی آنکھوں کے سامنے وہ بندوق گھوم رہی تھی اور کانوں پر چڑیوں کا شور سمایا ہوا تھا۔ ہر آواز وہ پہچانتا تھا اُن پرندوں کی جو سال بھر اسی جھیل کے کنارے رہتے تھے اور اُن کی بھی جو اُس موسم میں دو پہاڑوں سے اتر کر کچھ دنوں کے لیے مہمانوں کی طرح آتے تھے۔ اُن کی ہر آواز کا مطلب وہ سمجھتا تھا۔ وہ لڑ رہے ہیں یا مسرت سے گا رہے ہیں یا ساتھیوں کو خطرے کا بگل سنا رہے ہیں۔

جھیل کے پانی میں کلیلیں کرتے ہر پرندہ کے پروں کی سرسراہٹ کا احساس ہے۔ اسے چاہے وہ مرغابی ہو۔ سرخاب، جنگلی بطخ، چہا، بگلا، سارس، تلکھا، ریتی، سردپ پنکھی یا سونا، پتری ان کی سیٹیوں کی مدھر آوازیں اُس کے کانوں میں بسی ہوئی ہیں۔۔۔ اور تب اُس کا دل اُس بندوق کے خیال سے دھڑکنے لگا۔

اُدھر بندوق چلی تھی اور گولی کی ٹوٹتی ہوئی آواز بادلوں میں گونج گئی تھی اور اس کے بعد پرندوں کا مضطرب شور! دل پر چوٹ سی لگی تھی اس کا دل اداس ہو آیا تھا۔ کچھ فاصلے پر ساتھی مزدور کام میں لگے نظر آرہے تھے، ایک لحہ ٹھٹک کر اُس نے پیچھے دیکھا۔ دلدل خاموش تھا اور اوپر سے اڑ کر بھاگتی ہوئی چڑیوں کی خوفزدہ آواز کو صبر سے پیتا جا رہا تھا۔۔۔ مڑ کر وہ تیز قدموں سے لوٹ آیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

رات کو جب درختوں کے نیچے سانجھے چولہے جلتے تو مہیسا نہیں تھا۔ گاؤں سے پیاز اور مصالحہ لانے والے چرن سنگھ نے بتایا کہ وہ بدماس گھی کی چپڑی روٹی کھائے گا آج۔

"کہاں؟ گاؤں میں ہے؟" بھجو نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہاں پنڈ تائن کے گھر ہے۔ چبوترے پر بیٹھا چونچلے کر رہا تھا لگائی سے۔۔۔ اور وہ ناس ماری مسکرا مسکرا کر بات کر رہی تھی چھلے دار بال کاڑھے اور زیور پہنے ساتھ بیٹھی تھی۔۔۔ مرا سالا!" چرن سنگھ نے بیچ سے تھوکا اور پیاز کی گانٹھ چھیل کر کھانے لگا۔

"اس سے کیسے آشنائی ہو گئی؟" بھجو نے تسلے میں آٹا سنبھالتے ہوئے رازدارانہ آوازوں میں پوچھا۔

"چاہے تو تو کر لے! کون مشکل ہے لیکن اس نرک میں کون کودے؟۔۔۔ وخت تھا جب ہمارے پیچھے تنگ گئی تھی۔۔۔" عادت کے مطابق چرن سنگھ بات اپنے پاس سے بنا رہا تھا۔

"کبڑا نہ ہوتا تو شاید بیاہ رچا لیتی!" ہوری نے جیسے چرن سنگھ کے کبڑے پن پر گہرا وار کیا۔ "بیٹھ جا سیدھی طرح ــــ ہوں!۔۔۔ تیرے پیچھے لگ گئی تھی! گاؤں کے ٹھاکر نے جان دے دی، پر نظر نہیں ملائی اس نے!"

"اصل میں اُس کو پیسے کا غرور ہے۔ بھجو نے روٹی گرم توے پر ڈالتے ہوئے کہا، "اس گاؤں میں ایسی عورت نہیں ملے گی! اکا روپ ہے اور کاٹھی ہے رام کسم!"

چرن سنگھ نے سسکاری بھری اور بھجو کی بات کا مطلب واضح ہو گیا۔ چولہے کی آنچ میں اس کا کبڑا پن کدو کی طرح لگ رہا تھا۔ ہوری کی آنکھ کے نیچے لٹکا ہوا بڑا سا گوشت کا لوتھڑا سوجا ہوا تھا۔ کبڑے نے کاٹ لیا، "کہتے ہوئے اُس نے بھرے ہاتھ سے آنکھ کے نیچے سہلایا اور بولتا گیا، "گھی میوہ کھاتی ہے ٹھسک سے رہتی ہے پنڈ تائن۔"

"چالیس کی لگتی ہے۔" بھجو نے روٹی پلٹی۔

"مہیسا کی عمر کتنی ہو گی؟" اس نے دریافت کیا۔

"ہو گا پچیس چھبیس کا!" چرن سنگھ بولا۔

"پھرتی۔۔۔" کہہ کر ہوری شیطانی سے ہنس پڑا۔

جھیل تک وہ سڑک تو پوری نہیں بن پائی۔ لیکن مہیسا گینگ سے بچھڑ گیا۔ بیوہ پنڈ تائن نے اس سے شادی کر لی تھی۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں کہیں۔۔۔ کسی کا کہنا تھا کہ جوان دیکھ کر پنڈ تائن نے پھانس لیا اور کوئی کہتا کہ مہیسا روپیہ پیسہ دیکھ کر لڑھک گیا۔۔۔ جو بھی ہو دونوں طرح سے لوگوں کو یہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کیونکہ کسی کو برا دیکھ کر لوگ برداشت نہیں کر پاتے اور اچھا دیکھنا ان سے سہا نہیں جاتا۔ لیکن مہیسا نے کسی کی پروا نہیں کی۔ پنڈ تائن پھر سے سہاگن ہوئی تھی اور اتنے دنوں بعد جب اس کی مانگ میں سیندور اور گورے ماتھے پر چھلے دار بالوں کے درمیان بندیا چمچمائی تو اس کا روپ دُگنا ہو گیا۔ دوہرے بدن کی پنڈ تائن جب چاندی کی کردھنی باندھ کر چلتی اور پیروں میں جھانجیں جب چھن چھن بولتیں تو لوگوں کے دل دہل جاتے۔

راستہ میں ساتھ چلتے مہیسا سے پاربتی پنڈ تائن کہتی، "تمھیں تو ذرا بھی شعور نہیں ہے۔ مرد گھر والی کے آگے آگے چلتا ہے ساتھ نہیں۔۔۔ لوگ کیا کہیں گے؟۔۔۔ آگے چلو!"

اور سر پر صافہ باندھے مہیسا کہتا، "بڑی سرم آگئی ہے! سہر میں میم لوگ اسی مافک چلتی ہے بلکن بانہہ میں ہاتھ پھنسا کے۔" اور بستی کے بازار سے خریدا چمکدار کیلا سن کا جمپر جھلملاتا دیکھ کر اس کا ماتھا فخر سے اٹھ جاتا۔ پاربتی کتنی خوبصورت ہے۔

اور ایک دن دیویوں کی پوجا کے لیے جب پاربتی نے مہاور لگایا تو چمچے میں گھلا لال رنگ انگلی میں لے کر اُس نے پاربتی کے لبوں پر لگا دیا۔ پاربتی چھٹانے لگی تو اس نے۔۔۔ اپنی قسم دے دی اور نمائش سے لائے شیشہ کو اس کے سامنے کر دیا۔ پاربتی نے شرماتے ہوئے

اپنے لال ہونٹوں کو دیکھا۔ لیکن اپنی خوبصورتی کی شوخی سے بھر کر بولی، "تم تو میم سے سادی کرتے! لال پاؤڈر والی سے۔" اور وہ اپنے کو خود کسی میم سے کم نہیں سمجھتی تھی!

تبھی مہیسا نے اس کی گداز کلائی پکڑتے ہوئے کہا، تم کدھر سے کم ہو!" اور پاربتی کے اجلے دانتوں کو دیکھ کر اُس کا دل کھل گیا۔۔۔ پاربتی کے دانت ٹھیک ویسے تھے جیسے اس نے کبھی دیکھے تھے۔ ہنس کے پیروں کی مانند دُھلے ہوئے۔

پاربتی کے کہنے سے اُس نے قلمیں بڑی بڑی رکھوائی تھیں۔ میلے تماشے پر جانے کے لیے بیلوں کی ایک جوڑی اور چھوٹی سی مجولی بھی خرید لایا تھا۔ بیلوں کو خوب سجا کر رکھتا تھا۔ اُن کے گلے میں چالیس گھنگھروؤں کی مالا تھی اور سینگوں پر پالش مجولی کی چھت کے لیے رنگین جھالر پاربتی نے سی تھی اور گھیاں وہ درزی سے بنوا لایا تھا۔ پہیوں کے اوپر رتھ کی طرح ہاتھ لگوایا تھا اور سن کی نہیں، سوت کی رنگین ڈوریوں سے کنارے بنوائے تھے۔ ست رنگی مجولی تھی مہیسا کی پر ایک دفعہ دوڑ میں داؤ لگا آیا تھا اور پاربتی کے پیچھے پڑ گیا تھا، "تم ساتھ نہیں بیٹھو گی تو دوڑ میں نہیں جاؤں گا۔" اور اس نے بہت سمجھایا تھا، "ہمارا تماشہ دکھاؤ گے۔۔۔ بہت لڑکپن ہے تم میں۔۔۔؟"

مہیسا ہنس پڑا تھا، "اور تم بوڑھی ہو گئی ہو نا! سرم نہیں آتی ہمارے سامنے کہتے؟۔۔۔ بتیا بچھری سے دانت ہیں۔ بات بڑی بوڑھیوں کی طرح کرو گی!"

اور میلے کی دوڑ کے لیے جاتے جاتے جب بنجر زمین سے رتھ گزر رہا تھا تو پاربتی نے چالاکی سے اس کو منا لیا تھا اور من میں ملال لائے بغیر مہیسا میلا دکھا کر بغیر دوڑ میں حصہ لیے لوٹ آیا تھا۔

بستی میں ہر دم مہیسا اور پاربتی کی بات ہوتی لیکن دونوں کو کسی کی فکر نہیں تھی۔ پاربتی روپے کا لین دین کرتی اور سب کی چوٹی اپنے پاؤں کے نیچے رکھتی۔ بستی میں کون ایسا تھا جس کو وقت بے وقت چار پیسے کی ضرورت نہیں پڑتی! اس لیے وہ لوگ بھی جو پیٹھ پیچھے پاربتی اور مہیسا کو کوستے، سامنے آکر چکنی چپڑی باتیں کرتے۔

اس کا احساس دونوں کو تھا۔ لیکن دونوں اتنے فراخ دل تھے کہ کبھی انھوں نے دل نہیں جلایا، مہیسا اب بے فکر ہو گیا تھا۔ کام دھام کرنے کی اس کو ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن اب بھی جب وہ سپاٹ لوگوں کی جھیل کی جانب جاتے دیکھتا اور ان کے

ساتھ کوئی خوبصورت عورت ہوتی تو وہ اپنے آپ کو روک نہ پاتا پیچھے پیچھے چلتا ہی جاتا اور چاہتا کہ وہ عورت اُس سے بات کرے۔ اور جب وہ عورت اُس سے بات نہ کرتی تو وہ چڑیوں میں مشغول ہو جاتا۔ پُر سکون جھیل کے کنارے کنارے چکر کاٹتا، نرکلوں کے درمیان ساگودانے کی طرح پھیلے ہوئے مچھلیوں کے انڈے کو دیکھتا اور نیل پنکھی کے جوڑوں کو تاکتا۔۔۔ بگلے کو محوِ خواب دیکھ کر وہ سانس روک کر ٹھہر جاتا اور اُس کے شکار کرنے کا انتظار کرتا۔ دیر ہو جاتی تو گھر کی یاد آتے ہی لوٹ پڑتا۔

ایک بار وہ دن بھر نہیں آیا۔ آدھی رات کو لوٹا۔ پاربتی نے ناراض ہو کر پوچھا تو بھولے پن سے کہہ دیا، "جنگل تک گیا تھا۔"

"جھیل پر گھوم کر جی نہیں بھرتا؟" پاربتی نے طعنہ دیا تو بڑی صفائی سے اس نے بتادیا، "جنگل میں تیتر دیکھنے گیا تھا۔ سسرے دھول میں نہاتے ہیں۔"

"تیتر ویتر کچھ نہیں، تم کہیں اور گئے تھے۔ سچ سچ بتاؤ مجھے!" پاربتی کچھ سخت ہو گئی۔

"تیتر دیکھنا تو بندو کے گھر دیکھ لیتے۔ وہ تیتر لڑاتا ہے۔"

"پنجرے میں بند تیتر کیا دیکھنا،" مہیسا نے کہا، "مجھے کچھ پالنا تو ہے نہیں۔ معلوم نہیں لوگ کیسے چڑیوں کو پالتے ہیں۔"

تبھی اوپر آسمان میں کچھ پرندوں کا جھنڈ اڑتا گزر گیا۔ اُس کی آنکھیں آسمان میں گڑ گئیں۔ ایک دم بولا، "یہ چکوروں کو جھنڈ ہے۔۔۔ دیکھ پاربتی۔ اب رات بھر یہ مچھلی کا شکار کریں گے۔"

پرندوں کے نرم پروں کی ریشمی آواز دور چلی گئی تھی۔

"وہ کچھ بھی کریں۔ تم ہماری بات کا جواب دو۔ سچ سچ بتاؤ کہاں گئے تھے؟"

"ایمان سے بتادیا۔"

"لیکن آدھی رات تک تیتر ہی دیکھتے رہے؟" پاربتی کے لہجہ میں شک تھا۔

"ہاں۔ ہاں پاربتی، مانا تو کرو۔۔۔ دیکھو پیروں میں کتنے کانٹے چبھ گئے ہیں۔ لڑنا ہے تو سویرے لڑیں گے۔" کہہ وہ آرام سے ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔

پاربتی نے بات بدل دی، "روپیہ بہت پھیل گیا ہے۔ وصول نہیں ہوتا تم ذرا لوگوں کو ڈانٹو ڈپٹو۔"

"یہ ہم سے نہیں ہو گا۔"

"اچھا سنو! میرا من ہے کہ کچھ روپیہ لگا کر یہاں چبوترے پر ایک مندر بنوایا جائے۔۔۔ اور بن سکیں تو مسافروں کے لیے دو کوٹھریاں بھی بن جائیں۔ تھکے ماندے لوگوں کو آرام ملے گا اور کچھ روپیہ دھرم کے کاج میں لگ جائے گا۔"

"یہ دھرم کرم تمھیں کب سے ستانے لگا؟"

"بہت دن کی آرزو ہے دل میں! مستری کو بلا کے زمین بھی دکھائی تھی پھر کچھ ہو نہیں پایا۔۔۔ مر جاؤں تو میرے نام کا ایک مندر تو رہے گا۔ دس دلوں سے دعا نکلے گی۔"

پاربتی نے بڑی سچائی سے بات کہی۔

"بے وقت یہ بات کیسے سوجھ گئی تمھیں؟" مہیسا نے پوچھا۔

"آج دن بھر یہی بات تو سوچتی رہی۔"

مہیسا نے غور سے دیکھا پاربتی کو۔ چاندنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، واقعی پاربتی بہت بدلی سی لگی۔ آج اُس کو لگا کہ سچ مچ پاربتی اُس سے بہت بڑی ہے اور اُس کے چہرے پر نیلی لکیروں کا جال بننا شروع ہو رہا ہے۔ بانہوں کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ کولھے پر بھاری پن آ گیا ہے۔ لیکن پھر بھی اُس کے چھلے دار بال اس کو اچھے لگ رہے تھے۔۔۔

"کا دیکھ رہے ہو؟" پاربتی نے آنچل کا پلّو اوپر سرکا لیا۔

مہیسا خاموش دیکھتا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔ پاربتی نے پھر ٹوکا تو مہیسا نے یوں کہہ دیا، "مندر بنانا ضروری ہے؟"

پاربتی سمجھ گئی کہ اُس کے دل بات یہ نہیں ہے مہیسا کی آنکھوں میں ابھی جو سونا پن اس نے دیکھا تھا وہ کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ پاربتی نے کچھ اداس لہجے میں پوچھا، "ہم سے شادی کر کے پچھتاتے تو نہیں ہو؟"

"ایں۔" مہیسا اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔

"آج سوچ سوچ کے دکھ ہوا۔۔۔ اپنے سکھ کے خاطر ہم نے تمھیں خراب کر دیا۔" پاربتی کی آنکھوں میں نمی تھی۔ "پچھتاوا تو ہوتا ہو گا۔ سچ سچ بتانا۔"

"کاہے کا پچھتاوا پاربتی؟" مہیسا نے کہا، "ہم نے کبھی یہ سب سوچا ہی نہیں۔ ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

"تم نے کبھی کچھ نہیں سوچا؟ شادی کی بابت بھی نہیں سوچا تھا؟" پاربتی نے جیسے اس کو کریدا، "ابھی تم اپنے کو آزاد سمجھتے ہو۔ بال بچے ہوتے تو سمجھتے!" کہتے کہتے اس کی آواز بھاری ہو آئی۔ چاند پر بادل آجانے سے چاندنی مٹیالی ہو گئی تھی اور پاربتی کا چہرہ دھندلا پڑ گیا۔ لالٹین چوکھٹ میں کنڈی سے لٹکی تھی اور اس کی روشنی میں کھاٹ کی ادوائن سایوں کی سلاخیں بن رہی تھیں۔

مہیسا کو یکایک لگا کہ شادی کے بعد سب گھروں میں بچے ہوتے ہیں۔ اُس کے گھر میں ابھی تک کچھ نہیں ہوا اُس نے گہری نظروں سے پاربتی کو دیکھا۔ اُس وقت کی بات وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ آخر پاربتی کہنا کیا چاہتی ہے؟ گھر میں سناٹا طاری تھا۔ ایسے سونے پن میں اُس نے پاربتی کے ساتھ کبھی تنہائی نہیں محسوس کی ہے لیکن آج وہ اتنی الگ سی کیوں معلوم ہو رہی ہے؟ ہمیشہ رات اور دن کو تنہائی میں اُس کے دل میں پیار ہی اندا ہے۔ اور اس نے کبھی ایسی اکھڑی باتیں نہیں کیں۔

"تمھیں ہوا کیا ہے؟" مہیسا نے شاید آج پہلی بار اتنا سوچ کر پوچھا تھا۔

"معلوم نہیں کا ہوا ہے۔ بستی کا اسپتال بہت چھوٹا ہے۔ یہاں میری دیکھ نہیں ہو پائے گی۔"

"ہسپتال، لیکن ہسپتال کی کا ضرورت ہے؟" مہیسا اور الجھ رہا تھا۔

"تمھاری نا سمجھی کے لیے کا کہوں، یہاں گھر پر میری دیکھ بھال کون کرے گا۔ رشتہ دار بھی نہیں جو ضرورت کے وقت پر آجاتے۔ سنا ہے اسپتال میں تکلیف نہیں ہوتی۔ ایسی دوا دیتے ہیں ڈاکٹر جی۔"

مہیسا ہنسا۔ اب سمجھ پایا تھا، وہ جوش سے بھر کر بولا، "ضلع اسپتال میں چلی چلنا۔ پیسہ سب دیکھ بھال کرا دے گا۔ بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔"

لیکن پاربتی اُس کی خوشی میں حصہ نہیں بٹا پائی۔ اُس کے دل میں جیسے ڈر سمایا ہوا تھا۔ بولی، "ایک بات کہوں؟ ہمیں بڑا ڈر لگتا ہے۔ جان چلی جائے گی۔"

"بیکار ڈرتی ہو تم!"

"بیکار نہیں۔ نہ جانے من میں کیسی کیسی باتیں آتی ہیں! بڑے ڈراؤنے سپنے دکھائی پڑتے ہیں۔ سانس رکنے لگتی ہے!" پاربتی نے بانہیں چھاتی پر کس لی تھیں۔

"تو ہمارے ساتھ لیٹا کرو۔" مہیسا نے طریقہ بتادیا۔

"کچھ تو سوچا کرو!"

"ہم کہیں کہ آج کل تم کترائی کترائی کا ہے رہتی ہو۔۔۔ بیکار کی باتیں دل میں مت لایا کرو پاربتی! آ کھاٹ ٹین میں کر لیں۔"

پاربتی نے اٹھ کر کھاٹ پکڑاتے ہوئے کہا، "اب اتنا باہر مت رہا کرو۔ نہ جانے کب کیا ہو جائے۔"

مہیسا نے چارپائی سے چارپائی ملالی اور پٹی کے پاس سرک کر ہاتھ اُس کی بانہہ پر رکھ دیا، "اب ڈر نہیں لگے گا تمھیں۔"

کچھ دیر بعد پاربتی تو سو گئی لیکن مہیسا کو نیند نہیں آرہی تھی۔ پاربتی کا پیر ذرا یک ہلا اور سانس تیز ہو آئی۔ جیسے وہ ڈر رہی ہو۔ مہیسا نے اٹھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ بڑی دیر تک بیٹھا دیکھتا رہا اور جب اُس کو نیند آنے لگی تو لوہے کا ایک چاقو لا کر اُس نے پاربتی کے سرہانے رکھا اور لیٹ گیا جیسے پاربتی ننھی سی بچی ہو۔

اُن دنوں اس کا جی بہت بھرا بھرا رہتا۔ پاربتی اس لائق نہیں تھی کہ اُس کو جھیل تک لے جاتا خود بھی بیٹھتا اور اُسے بھی دکھاتا وہاں کی خوبصورتی۔ اس لیے وہ آس پاس ہی کچھ دیر کے لیے چلا جاتا۔ حافظ جی بساطی کی دکان پر اگر بیٹھ جاتا تو پاربتی کے لیے ناخنوں کی لالی کوئی چھوٹا سا شیشہ یا کوئی ایسی چیز خرید لاتا جسے حافظ جی نئی چال بتادیتے۔۔۔ ایک دفعہ حافظ جی نے اُس کو فوٹو فریم دکھا کر کہا، "اس میں میاں بیوی کی تصویر لگتی ہے۔ بڑے گھروں میں لوگ اس کو رکھتے ہیں۔" فوٹو فریم تو وہ لے آیا۔ لیکن تصویر نہیں تھی۔ تیسرے ہی دن اُس نے پاربتی کو تیار کرایا۔ سارے زیورات اس کو پہننے پر مجبور کیا اور خوب تیل لگا کر راما فوٹوگرافر کی دکان پر جا پہنچا۔

ساتھ ساتھ بیٹھتے ہوئے اُس نے پاربتی کے سر کا پلّو کانوں کے پیچھے کر دیا اور اپنی قمیض کی جیب میں ست رنگا ریشمی رومال رکھ لیا۔ اپنے گلے کا تعویذ بھی کھینچ کر اوپر قمیض پر نکال لیا تاکہ تصویر میں سب کچھ دکھائی پڑے۔ اپنے پیچھے باغ کا پردہ لگوا جس میں دو چڑیاں چونچ سے چونچ ملائے بیٹھی تھیں۔ پاربتی کو بھی وہ پرندہ پسند آیا تھا۔

لیکن تصویر میں وہ سب تو ٹھیک آ گیا افسوس صرف بالوں کا تھا۔

"سسرے نے ہمیں بوڑھا بنادیا!کا ہے پاربتی؟"

"تمھیں بڑا شوق چرایا تھا۔ایک روپیہ خراب کردیا۔"

لیکن مہیسا کو ایک اس بات کا ملال نہیں تھا۔ اُس نے تصویر کو فریم میں لگوا کر برامدے والی گھرونچی پر سجادیا۔"ایسی تصویر مشکل سے کسی کے گھر نکلے گی۔۔۔مختار صاحب کے گھر ہی ہوسکتی ہے!"

اُس دن وہ حافظ جی کی دکان پر بیٹھ کر لوٹ رہا تھا۔پاربتی کے بالوں میں لگانے کے لیے ولایتی پن کے پتے پر بنی میم کو وہ تاک رہا تھا کہ پاربتی نے پوچھا۔

"مندر کے لیے مستری سے بات ہوئی؟"

"مستری تو نہیں ملے پر ایک نئی بات سننے میں آئی ہے۔"

"کا؟"پاربتی نے اشتیاق سے جاننا چاہا۔

"اپنی بستی میں بجلی لگ رہی ہے چنگی والے بڑی کوشش میں ہیں لیکن پیسہ پاس نہیں ہے چنگی کے۔"

"تو بجلی کا لگے گی۔"

"سنا کہ چنگی اپنی کچھ زمینیں بیچنے کی باتیں سوچ رہی ہے۔ایسی زمین جو اُس کے لیے بیکار ہیں۔"مہیسا نے کہا تو پاربتی ایک دم بولی،"چنگی اگر بیچے تو اپنے چبوترے کے قریب والا کوڑہ خانہ ہم خرید لیں۔۔۔"

"چبوترے پر مندر ہو جائے گا۔ اور اُدھر مسافروں کے لیے چھوٹی سی دھرم شالہ!تم ذرا سچی بات کا پتہ لگاؤ۔"

"بات تو سچی ہے۔ حافظ جی کا روز چنگی میں آنا جانا رہتا ہے۔غلط خبریں نہیں لائیں گے۔ وہ ہی بتا رہے تھے۔"مہیسا نے جیسے اس کو یقین دلایا۔"موقع لگا تو خرید لیں گے۔"

"کا پتہ کب تک ہو؟"

جھیل کی جانب سے تبھی چڑیوں کا مضطرب شور سنائی پڑااور اس کا جی بہک گیا۔ ایک دم بولا،شاید شکاری آئے ہیں۔"

اوپر آسمان سے"آنگ آنگ"کرتے چکوروں کے جوڑے گزر رہے تھے۔مہیسا کا

دل ندامت سے بھر آیا۔ بولا، "انھیں مارنے سے فائدہ! اتنی سندر چڑیا ہے پر مردہ کھاتی ہے۔"

'آج کل نئی نئی چڑیاں بہت دکھائی پڑتی ہیں پہچان میں بھی نہیں آتیں۔" پاربتی نے کہا، "نہ جانے کہاں سے اتنی آجاتی ہیں۔"

"یہ چڑیاں مہمان ہیں۔۔۔ کارتک ختم ہوتے ہی آتی ہیں اور پھاگن چیت تک چلی جاتی ہیں،" مہیسا پاربتی کو بتا رہا تھا، "میں نے چڑیوں کے انڈے بھی جمع کیے ہیں تجھے نہیں بتایا۔ نہیں تو گھر سے نکال دیتی۔"

"اب بھی نکال سکتی ہوں۔" پاربتی کہہ رہی تھی کہ "دکھاؤں" کہتا ہوا مہیسا اٹھ کر گیا اور طرح طرح کے چتکبرے، ہریالے سے انڈے اٹھا کر لے آیا۔

"دیکھ پاربتی یہ واک کا انڈا ہے۔ یہ سارک کا اور یہ سوناپتری کا۔" مہیسا ایک ایک انڈا دکھانے لگا۔ ویسے تو پاربتی نہیں چھوتی۔ لیکن اُس نے سوناپتری کا انڈا ہاتھ میں لے ہی لیا۔ گھما کر دیکھتے ہی ہاتھ سے چھوٹ کر وہ گر پڑا اور ٹوٹ گیا تو پاربتی کے منہ سے چیخ نکل گئی "ہائے دیا۔"

"ٹوٹ گیا تو کیا ہوا؟" مہیسا نے سادگی سے کہہ دیا۔

لیکن پاربتی کے چہرے پر کالے بادل سے چھا گئے تھے، اُس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ بہت مدھم لہجہ میں بولی، "براشگن ہو گیا" اور آنچل میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

پاربتی جیسے اُس دن مستقبل کے اندیشوں کو سوچ کر روئی تھی۔ بالکل ویسے ہی پُر سوز اور لاچاری سے بھری اُس کی آواز زچہ بچہ ہسپتال میں تھی۔

مہیسا کو سب کچھ یاد ہے، یہ کیسے ہوتا ہے کہ آدمی ہمیشہ ایک ہی طرح سے روتا ہے۔۔۔ پاربتی کی وہ آواز اُس کو بھولتی نہیں جب اُس نے ہسپتال کے پلنگ پر پڑے ہوئے مہیسا کو اپنے پاس بلایا تھا۔ "اتنے دن چڑھ گئے ہیں۔ ڈاکٹرنی کہتی ہیں چیرا لگانا پڑے گا۔" پاربتی کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ چیرے کا نام سن کر آنکھوں میں آنسو بھر کر اُس نے مہیسا کی بانہہ پکڑلی تھی اور بڑے ہی درد بھرے لہجے میں کہا تھا، "اب میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ پتہ نہیں بھگوان کو کیا منظور ہے۔"

"دل چھوٹا کیوں کرتی ہو پاربتی؟ تم جیتی جاگتی گھر پہنچو گی۔۔۔ میں مندر بناؤں گا

اور مسافروں کے لیے دھرم شالہ!"

لیکن پاربتی جیتی جاگتی گھر نہیں پہنچی۔ بچہ پیٹ میں مر گیا تھا اور آپریشن کے بعد بھی اُس کی بگڑتی حالت کو اکیلی ڈاکٹرنی سنبھال نہیں پائی تھی۔۔۔ سارا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ پاربتی کے جسم میں زہر پھیل گیا تھا۔

اور مہیسا کو پاربتی کا ہلکا نیلا پن لیے جسم ٹھیک ویسا ہی لگا تھا جیسا کہ اس دن چاندنی میں اس نے دیکھا تھا۔ پاربتی کی سانسیں دھیمی پڑتی جا رہی تھیں۔ وہ ایک دم بے فکر لگ رہی تھی اور اُس نے مہیسا کو قریب بلا کر کہا تھا، "اب مندر ضرور بنوانا ـــــ پاربتی مندر!"

مندر! سوچ کر ہی مہیسا کا کلیجہ پھٹ گیا تھا۔ آخری آس تھی اُس کو چیخ کر بولا تھا، "ایسا مت کہو پاربتی! بچہ مر گیا تو کیا ہوا تو تو جیتی جاگتی ہے۔"

"مجھے دیکھ لو اچھی طرح دیکھ لو ـــــ" پاربتی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ بہہ کر کانوں کے پاس سے ہوتے ہوئے نیچے گر رہی تھی۔۔۔ پھر۔۔۔ اُس سے نہیں دیکھا گیا جیسے پاربتی کی جان کھنچی جا رہی تھی اور پھر پاربتی کے پچھنے ہونٹ سوکھ کر چپک گئے تھے۔۔۔

مہیسا کی دنیا ویران ہو گئی تھی اور ویرانہ دیکھ کر آدمی پگلا ہو جاتا ہے۔ بستی کے آدمیوں کا یہی کہنا تھا کہ مہیسا پگلا گیا۔ جو آدمی آدمی کا خیال نہیں کرتا وہ پاگل نہیں تو اور کیا ہے؟ آدمی کے دکھ درد کو جو نہیں سمجھتا اس کو اور کیا کہا جائے؟ مہیسا وہ آزاد اور بے فکر مہیسا ایک دم بدل گیا تھا۔

اُس کو صرف پیسے کی فکر تھی۔ پاربتی کا پھیلا ہوا روپیہ وہ بڑی سختی سے وصول کر رہا تھا۔۔۔ گھر کی تنہائی اُس کو کاٹنے دوڑتی۔۔۔ اتنا پیار پا کر اب جیسے اُس کی عادت بگڑ چکی تھی۔

لوگوں نے کہا، "مہیسا پنڈت! دوسری شادی کر لو ـــــ اتنا روپیہ کس کام آئے گا؟ آس اولاد بھی تو نہیں!"

مہیسا نے جواب دے دیا، "پاربتی کے برابر کوئی میرا خیال کرے تو سوچوں بھی۔۔۔ نہیں تو بھی نہ سوچوں۔ غلط بات بول گیا۔۔۔ بیکار کا مخول مت کیا کرو۔ اب بوڑھا ہو چلا۔"

یوں پاربتی سے دس برس چھوٹا تھا لیکن پاربتی کی موت کے بعد وہ اُس سے دس

برس بڑا لگنے لگا تھا۔ کنپٹیوں پر تین ہی برس میں سفیدی آ گئی۔ اور گردن کے نیچے کی کھال جھریوں سے بھر گئی۔ سچ مچ۔ آدمی بوڑھا نہیں ہوتا۔ وقت اُس کو بوڑھا بنا جاتا ہے۔

سُونے گھر میں مہیسا آٹھ آٹھ آنسو روتا اور اُس کو پاربتی کی ایک ایک بات یاد آتی۔۔۔ چیزیں دیکھتا تو آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔۔۔ وہ ٹین کا صندوق جس میں اُس کے کپڑے رہتے تھے۔۔۔ اور جس میں پاربتی اپنے رقعے اور روپے رکھتی تھی۔۔۔ صندوق کے اوپر والی کیل میں کناری میں بندھی چوڑیوں کا گچھا دیکھ کر وہ اس دن رو پڑا تھا۔۔۔ ایک ایک چوڑی اُس نے پہچان لی تھی۔۔۔ کون کس میلے میں پہنائی تھی اُس نے۔۔۔ اور دوسرا جوڑا پہننے کے وقت اُس نے کب کب ان چوڑیوں کو اتارا تھا۔۔۔ پُر نم آنکھوں سے وہ دیکھتا رہا۔۔۔ گھر کا سونا پن اُس کو اب کاٹنے دوڑتا۔۔۔ دیوار پر سگنوتی کی لکیریں بنی دیکھ کر اُس کو پھر کچھ یاد آیا۔۔۔ جب ایک بار وہ دو دن کے لیے کہہ کر چار دن بعد لوٹا تھا تو شاید تبھی پاربتی نے گیرو سے یہ سگنوتی اٹھائی ہو گی۔۔۔ وہ جو کچھ کرتی تھی اُس میں صرف اُسی کے لیے تو سب کچھ تھا۔ اور کون تھا اُس کا؟ نہ پاربتی کا تھا اور نہ اب مہیسا کو کوئی رہ گیا تھا۔۔۔!

اور جب وہ جگن نائی کے گھر دھرنا دے کر بیٹھ گیا کہ آج حساب معہ سود اور اصل کے لے کر اٹھے گا تو اس کی عورت نے اندر سے دکھی ہو کر کہا، "پنڈت تم تو اتنے جالم ہو کہ کسی کی عزت تو نہیں دیکھتے!۔۔۔ پاربتی چاچی منہ سے چاہے جتنا بگڑیں پر آدمی کی مریادا اور عزت کا خیال کرتی تھیں۔۔۔"

"یہ سب ہم نہیں جانتے! ہم روپیہ لے کر اٹھیں گے آج! پورا سو روپیہ ہے مع بیاج کے!" مہیسا نے کڑکتی آواز میں کہا اور چٹیا کی گانٹھ کھول لی۔

جگن نائی بہت گڑگڑایا، "مہاراج گھر کی بنیاد کھدوا لو تو بھی اس وخت پچیس سے ایک پائی زیادہ نہیں نکلے گا۔۔۔ تھوڑی سی مہلت اور مل جائے!"

آخر چار بھلے آدمیوں نے آ کر جب بہت سمجھایا تو مہیسا کسی طرح رام رام کر کے اٹھا۔

کچھ دنوں بعد مہیسا جو اب مہیسا پانڈے کے نام سے پکارا جاتا تھا، بستی سے چلا گیا۔ سنا مرزاپور کی طرف پتھر کی تلاش میں گیا ہے۔ قرضداروں نے اطمینان کی سانس لی لیکن وہ چندرہ دن کے اندر اندر لوٹ آیا۔ چودھری کے باغ میں بیٹھ کر بتا رہا تھا، "پاربتی مندر کے

لیے سامان دیکھنے گیا تھا۔ مورت جے پور سے منگواؤں گا۔"

لوگوں کا کہنا تھا کہ سونا چاندی ملا کر کل آٹھ دس ہزار کی پونجی ہے اُس کے پاس اور جو دیا دیا ہو سو الگ۔ اُس دوران میں اُس نے کافی بقایا رقم وصول کر لیا تھا۔

دھیرے دھیرے روپیہ اکٹھا کرنے کا اُس کا جوش ختم ہو گیا۔ حافظ جی کی دکان سے گزرتا تو آواز سن کر کہہ دیتا، "اب کیا کروں گا بیٹھ کر حافظ میاں؟۔۔۔ پہننے اوڑھنے والی تو چلی گئی۔"

ایک دن حافظ نے اُس کو ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ بیٹھے بیٹھے بات چل نکلی، "سنا، مندر بنوانے کی فکر میں ہو۔"

"بس یہی کام کرنا ہے حافظ جی، کسی طرح مندر اور ایک چھوٹا سا دھرم شالہ بن جائے تو من کو شانتی ملے۔ پاربتی یہی کہتی کہتی مر گئی۔"

"یہ تو دھرم کا کام ہے۔ بنانے کھڑے ہو گے تو دس آدمی ہاتھ بٹائیں گے۔ تم شروع تو کرو۔" حافظ جی نے اُس کی اُداس نظریں دیکھ کر تسلی دی، "کبھی ضرورت پڑے تو دس بیس روپے ہم سے بھی لے لینا۔"

"روپیہ پورا نہیں ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں میرے پاس کھاتی کھدی ہے پر سچ حافظ جی کل چار ہزار ہے، اتنے میں تو سمنٹ بھی نہیں آئے گا۔"

گاہک آتا دیکھ کر حافظ جی اُدھر الجھ گئے اور مہیش پانڈے اُٹھ کر چل دیے۔ ایسے ہی ایک دن وہ بستی کی طرف سے گھر جا رہا تھا کہ جھیل والے راستے پر کچھ لوگ دکھائی پڑے۔ اُس کے پیر اُدھر ہی اٹھ گئے کچھ سیاح تھے۔ چار مرد اور دو عورتیں۔ عورتیں سندر تو نہیں تھیں لیکن پھر بھی وہ اُن کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ کافی دنوں بعد آیا تھا وہ ادھر۔

نیلی جھیل خاموش تھی۔ کناروں پر گیلی آنکھوں کی طرح نمی تھی اور گھاس کی ٹہنیاں ہوا کے ساتھ دھیرے دھیرے پانی کو سہلا رہی تھیں۔ نرکل کی لمبی پتیاں پرندوں کی کلغی کی طرح کانپ رہی تھیں اور پانی میں ڈوبی سیوار کی سوتوں سے مچھلیوں کے بچے تیرا کر نکل رہے تھے۔ وہ کنارے پر آ کر بیٹھ گیا۔ پانی کے ننھے ننھے بلبلے نیچے سے اوپر سطح تک آئے تو لگا کسی مچھلی نے موتی اگل دیے ہوں۔ آبی پرندوں کی باریک آوازیں جھیل کے پانی میں گونج رہی تھیں اور اوپر درختوں پر پرندوں کے پروں کی سرسراہٹ اور سیٹیوں کی مدھم آوازیں

تمیہ ب۔

کالے سر اور سفید چھاتی والی گنگناتی رہی کی ہلکی سی سیٹی اس کے کانوں میں پڑی۔ آنکھیں ادھر اٹک گئیں جھیل کے اوپر وہ چکر کاٹ رہی تھی۔ کچھ اس طرح جیسے اُس کو چکر میں اڑانے والا نامعلوم ڈورا کسی کے ہاتھوں میں ہو اور وہ گھومتی ہی جارہی ہو۔ تبھی وہ تیر کی طرح پانی کے اوپر گر پڑی اور ایک چمکدار مچھلی اُس کی لمبی چونچ میں تھی۔

اچانک سنگیت کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔ آئے ہوئے سیاح لوگ کچھ گا بجا رہے تھے نیلی جھیل کے پُر سکون پانی میں اُن کے سر تیرتے ہوئے دور تک جارہے تھے۔ اُس کو بڑا سکون ملا۔

پھر سون ہنسوں کا ایک جھنڈ اپنے راگ کا سُر ملاتا ہوا جھیل کے دوسرے کنارے پر اتر پڑا اور دو چار ہنس گیہوں اور چنے کے کھیت میں گھس کر بیج کھانے لگے کہ گردن اٹھا اٹھا کر وہ یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ اجنبی ہوں اور واقعی وہ اجنبی ہی تھے۔ مہیش پانڈے کا من نہ جانے کیوں بھر آیا۔ یہ سون ہنس اب آئے ہیں چار پانچ مہینے رہ کر۔ اب پاربتی کی طرح چلے جائیں گے۔ یا پھر کسی شکاری کا شکار ہو جائیں گے۔ جیسے پاربتی ہو گئی۔ ان کے مٹیالے خون کی لکیروں سے بھر جائیں گے۔ اور ان کے پروں کو پکڑ کر شکاری یوں لٹکا لے جائیں گے جیسے مردہ پاربتی کو اسپتال کے مہتر پلنگ سے اٹھا کر اُس ویران برامدے میں لے آئے تھے۔۔۔

تبھی قر قرا بولا۔ سفید کلغی کا تاج پہنے وہ گردن لپکاتا ہوا چلا جارہا ہے۔ شاید آرام دہ ریتلی زمین ڈھونڈ رہا ہے قرقرا۔۔۔ پھر ایک بھیانک دھڑاکے کی آواز سے وہ چونک اٹھا۔ بائیں جانب سے دلدل سے مادہ سارس کی تڑپتی سی تیز چیخ آئی اور گونجتی رہی۔ وہ بار بار چیخ رہی تھی اور سارس مضطرب سا کچھ اوپر چکر کاٹ رہا تھا، کبھی وہ دلدل میں اتر کر چیختا۔ کبھی لمبے لمبے ڈگ بھر کے اِدھر اُدھر لپکتا اور ویسی ہی تیز آواز میں چیخنے لگتا۔ گری ہوئی مادہ کی آواز پھٹ گئی تھی اور اُس کی گردن کچلے ہوئے سانپ کی مانند تڑپھڑا رہی تھی۔

سون ہنسوں کا جھنڈ کنارے سے بھاگ کر کھیتوں میں چلا گیا۔۔۔ ابھی ابھی کچھ لمحہ قبل کا خواب ناک ماحول ایک دم بھیانک ہو اٹھا تھا۔ جھیل کا پانی حدود میں بندھا جیسے تھرا رہا تھا اور بھیگے کناروں پر مردہ سر ٹکرا رہے تھے۔ درختوں میں ابھی ابھی سنسناہٹ بھر گئی تھی۔ دلدل میں گھائل پڑے سارس کو اٹھا کر لانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کسی کی۔

مہیش پانڈے نے قریب آکر ان سیاحوں کو دیکھا۔ اس کو امید تھی کہ پاربتی کی طرح ایسے لمحوں میں ان عورتوں کی آنکھوں میں پانی ڈبڈبا آیا ہوگا لیکن انھیں تو شکاری کے نشانے کی تعریف بھری تھی۔

وہ گھر لوٹ آیا۔ رات بھر اُس اکیلے گھر میں اس کو بار بار وہی تیز آواز سنائی پڑتی رہی۔ پھر جانے کہاں سے اسپتال میں چیختی پاربتی کی آوازیں آنے لگیں۔۔۔ صبح ہوتے ہی اُس سے نہیں رکا گیا۔۔۔ وہ سیدھا جھیل پر پہنچا۔ جھیل کے اوپر کا دھواں دھیرے دھیرے صاف ہو رہا تھا۔ کانڈ کا جوڑا کنارے پر بیٹھا، کائی کھا رہا تھا۔ جھیل کی پُر سکون خوبصورتی نے اُس کو اس لمحہ بالکل متاثر نہیں کیا اُس کے پیر دلدل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مارس اُس کو دکھائی دیا۔ وہ مردہ پڑی مادہ کے پروں میں چونچ گڑا گڑا کر اس کو جگا رہا تھا شاید۔ اور جب وہ نہیں جاگی تو روتا ہوا جھیل کی جانب چلا آیا۔

وہیں درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ دیکھتا رہا۔ مان سرور اور کیلاش کے آتے ہوئے دیو ہنسوں کو جو گندھروں کے دیش سے آئے تھے پروا س کے لیے۔۔۔ نازک اور پاکیزہ پرندے۔۔۔ ہلکی کرنوں میں سونا پتاری کے سنہری پر چمچماتے اُس کا دل اداسی سے بھر گیا۔ ان پردیسی پرندوں سے کیا تعلق قائم کرنا! بیٹھے بیٹھے جب وہ اکتا جاتا تو بستی کی طرف چلا آتا۔

بستی میں پیمائش ہونے لگی تو لوگوں کو یقین ہوا کہ اب بجلی لگ جائے گی۔ مہیش پانڈے نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ "سنا اُتر طرف بہت بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ وہیں سے یہاں آرہی ہے۔"

تبھی منادی والا اعلان کرتا سنائی پڑا، "بحکم چیئرمین صاحب چنگی کی کچھ زمینوں کا نیلام بتاریخ ۴ جنوری سوموار کو چنگی احاطے میں سویرے آٹھ بجے سے ہوگا۔۔۔ زمینوں کے نقشے دفتر چنگی میں خریداروں کے لیے لگے ہیں۔ ہر خاص و عام کو خبر دی جاتی ہے کہ۔۔۔" اور منادی والے نے طبلہ پر بانس کی کھپچیوں سے چوٹ کی اور آگے بڑھ گیا۔

چار جنوری کے ابھی بیس دن تھے۔ مہیش پانڈے کے دماغ میں چبوترے کے قریب زمین گھومنے لگی۔ چنگی کو بجلی کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے اور اُس کو زمین کی دھرم شالہ کے لیے۔

مندر اور دھرم شالہ کی بات لے کر وہ سبھی کے پاس پہنچا۔ ”دھرم کا کام ہے جو کچھ مدد آپ لوگ کریں دھرم شالہ پنچایتی کر دی جائے گی۔ آپ لوگ بھی مدد کریں تو یہ کام ہو سکتا ہے۔“

اُن بیس دنوں کے درمیان وہ گھر گھر گھوما۔ مختاروں کے پاس گیا۔ حلوائیوں اور ویدوں کے پاس گیا۔ کپڑے کے آڑھتیوں سے لے کر انگریزی ڈاکٹروں تک پہنچا اور سب کا تعاون حاصل کرتا رہا۔

سب کی آنکھوں میں مہیش پانڈے کا رتبہ اور احترام بڑھ گیا تھا۔ اب وہ سر پر گیروا صافہ باندھنے لگا تھا اور ہاتھ میں لاٹھی لے کر چلتا تھا۔ جسم کچھ کمزور ہو رہا تھا۔

لیکن اس ڈھلتے جسم کے ساتھ بھی وہ دن بھر گھومتا اور اپنے صافے میں چڑیا کا گرا ہوا خوبصورت سا پر کلغی کی مانند لگا لیتا۔ چنگی کے دفتر میں جا کر وہ نقشے بھی دیکھ آیا تھا۔ نیلام کا دن قریب آ رہا تھا اور جوں جوں وہ دن قریب آ رہا تھا مہیش پانڈے کی اداسی اور بھی بڑھتی جاتی۔

جھیل پر شکار کھیلنے کے لیے آدمیوں کی بہت سی ٹولیاں اُس دوران میں آئیں اور اپنے گھر پر بیٹھے یا بستی میں گھومتے ہوئے اُس نے جب جب چیخیں سنیں اور صاحب شکاریوں کو نرم پر والی چڑیوں کو لٹکائے لے جاتے دیکھا، تب تب اُس کو پاربتی کی یاد آئی بے طرح۔ اُس کی حالت بھی تو اُس سارس کے جوڑے کی طرح ہی تھی۔۔۔

گھر میں لوٹتا تو اڑتے پرندوں کے نرم و نازک پروں کی سرسراہٹ اُس کو محسوس ہوتی جیسے پاربتی کیلاسن کی دھوتی پہنے نامعلوم طور پر گزر گئی ہو۔۔۔ پہاڑوں سے آئے مہمان پرندوں کے سفید اور سیمل کی روئی سے تجیلے پر اور پاربتی کے سفید دانت!

صبح اٹھا تو جی نہیں لگا اور وہ سکون پانے کے لیے جھیل کی جانب چلا۔

جھیل پر پہنچ کر اپنی لاٹھی سے وہ کائی کو بکھیرتا رہا۔ سیوار کے سوتوں کو الجھا کر اُس نے نکالا۔ ننھے ننھے بیج چن کر منہ میں ڈال لیے اور اٹھ کر اُدھر چلا گیا جس جانب جل منجری کھلی ہوئی تھی۔ جل منجری کے پاس سے ہی دلدل شروع ہو جاتا تھا۔ ناری کی بیل پانی میں تاروں کی طرح بچھی ہوئی تھی اور گانٹھوں کے قریب ننھے ننھے گھونگھے چپکے ہوئے تھے۔ سوت سی سفید ننھی جڑیں مچھلی کے اجلے پروں کی طرح دھیرے دھیرے کانپ رہی تھیں۔

دلدل میں گھس کر اُس نے منجری کے پھول توڑے اور گچھا بنا کر لوٹنے لگا۔

سونا پتاری کا جھنڈ رات بھر چارہ کھا کر اڑنے ہی والا تھا کہ ایک گولی اُس پار سے چھوٹی اور اڑتے سونا پتاری کے جھنڈ میں سے ایک چڑیا بلبلا کر جھپ سے جھیل کے بیچوں بیچ گر پڑی اُس کے سونے سے پَر پانی میں بکھر گئے اور نیلی جھیل کے خاموش پانی پر ایک ہلچل ہوئی۔ ایک لمحہ بعد ہی لال خون کی ایک پتلی سی لکیر پانی پر کھنچی اور سونا پتاری اُس پار جانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے نرم پَر پھڑ پھڑائے تھے اور پانی پر خون کی لکیر اُس کا تعاقب کر رہی تھی۔

جھرمٹ سے شکاری نکلے۔ اُنھوں نے دیکھا لیکن پرندہ تیرتا ہوا اُس کنارے نکل کر کسی جھاڑی میں دبک کر خاموش ہو گیا۔ شکاریوں نے بہت ڈھونڈا لیکن پرندہ نہیں ملا۔ جھیل پر مٹتی ہوئی لکیر کے درمیان ایک آدھ پَر پڑا تھا۔

اُس کا جی اچاٹ ہو گیا۔ جل منجری کے پھولوں کو وہیں پھینک کر لوٹ آیا۔

پاربتی کی یاد اُس کو پھر آئی اور نیلام والے دن اُس نے تین ہزار کی بولی لگا کر چبوترے کی قریبی زمین نہیں دلدلی نیلی جھیل خرید لی۔ لوگوں کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اس کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟

لیکن اُس نے کسی کو کچھ بھی جواب نہیں دیا۔ اور دل میں لگتا کہ اب تو وہ پاربتی کو بھی جواب نہیں دے سکتا۔ اُس کے پاس جواب ہے ہی کیا؟

پھاگن آتے آتے مہمان پرندے اڑ گئے۔ سون ہنس چلے گئے۔ سفید سُرخاب اپنے اپنے گھروں میں لوٹ گئے۔ مور، سند، سارس اور سرپ پنکھی بھی چلے گئے۔۔۔ جھیل بہت ویران ہو گئی تھی لیکن مہیش پانڈے کو یقین تھا کہ یہ پھر ہمیشہ کی طرح اپنے جھنڈوں کے ساتھ کارتک اگہن تک واپس آئیں گے۔

مہیش پانڈے لکھنا لکھنا تو جانتا نہیں تھا۔ بس جھیل والے راستہ کے پہلے درخت پر اُس نے ایک تختی لٹکا دی تھی۔ جس پر اُس نے لکھا تھا —— "یہاں شکار کرنا منع ہے۔" اور نیچے کا جملہ تھا —— "دستخط نیلی جھیل کا مالک مہیش پانڈے۔"

انتظار

رات اندھیری تھی اور ڈراؤنی بھی۔ جھاڑیوں میں سے اندھیرا اُبھر رہا تھا اور پتھریلی زمین میں جگہ جگہ کھڑے ہوئے پتھر مینڈکوں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ بجیلا نتے کے بوٹوں کی آواز سے دہشت اور بڑھ جاتی تھی۔ ہوا ہمیشہ کی طرح باغی تھی۔۔۔ لوگوں میں سنسنی یا دہشت دوڑ جاتی ہے لیکن ہوا اُسی طرح خاموش آواز میں گاتی، سرسراتی رہتی ہے۔ ہوا کی آواز تبھی ٹوٹتی ہے جب بجیلا نتے ٹیم کے بوٹ ریت یا دھول کے کارپیٹ پر سپ سپ کرتے ہیں یا مینڈک نما بیٹھے چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ٹکرا جاتے ہیں۔

پیریز شہر کے فری ٹاؤن علاقے کے باہر تو ماحول کی بستی جاگ رہی تھی۔ لیکن گھروں میں روشنی نہیں تھی۔ بجیلا نتے کے بوٹ روشنی سے بہت گھبراتے ہیں۔۔۔ جہاں بھی کوئی روشنی ٹمٹماتی ہے تو وہ اُسے بجھانے کے لیے، اس پر دھاوا کرنے کے لیے دوڑتے ہیں، لیکن وہ پتھروں سے گھبراتے ہیں۔۔۔ یا تو پتھروں سے اُن کے بوٹ ٹکراتے ہیں یا پتھر آ کر اُن کی کنپٹی پر پڑتے ہیں۔

مینڈکوں کی طرح زمین پر بیٹھے ہوئے پتھر رات میں کیسے اڑنے لگتے ہیں، یہ راز بجیلا نتے کی گشتی ٹکڑیوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اس لیے گشت والے ایک سپاہی نے پادری کے سامنے کہا تھا ـــــ رات میں یہ پتھر اڑتے ہیں۔۔۔ ہولی فادر! یہ آسمانی مصیبت ہے۔۔۔ ہمیں جب فری ٹاؤن کے علاقے کے باہر تماحول کی اِس بستی میں بھیجا گیا تو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہاں بھوت پریت رہتے

ہیں۔۔۔ہم سے کہا گیا تھا ـــــ تو ماحول میں نیگرس رہتے ہیں۔۔۔ لیکن یہاں تو پتھر ارتے ہیں۔

جھونپڑی نما چرچ میں جلتی موم بتیوں کی روشنیوں میں کالا پادری مسکرایا تھا، مائی سن! تماحول بھوت پریتوں کی بستی نہیں۔۔۔ شیطان نے کہیں اور جنم لیا ہے۔۔۔ شیطانوں کو پہچانو۔۔۔ تمھیں سکون ملے گا!

سپاہی اپنی سوجی آنکھ اور کنپٹی سہلا رہا تھا۔ اُس نے اپنی ناک صاف کی تو خون کے قطرے دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا۔

ہسپتال کے ڈاکٹر نے رپورٹ دی تھی کہ کیڈٹ تھری زیرو ون دماغی طور پر کمزور ہے۔ تعجب ہے کہ اُس جیسے بزدل کو بگیلا بننے میں چنا گیا۔ اُس کے دماغ میں بھوت پریت بھر گئے ہیں اور اُسے پتھر اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ اگر رانی کی حکومت اور گوری تہذیب کی ہمیں حفاظت کرنی ہے تو تھری زیرو ون جیسے بزدلوں اور توہم پرستوں سے بھی ہمیں اپنی حفاظت کرنی ہوگی۔

چیف وہ رپورٹ دیکھ کر بھڑک اٹھا ـــــ از اٹ اے بلڈی میڈیکل رپورٹ؟ ڈاکٹر تک ہمیں سیاسی رپورٹ دینے لگے ہیں۔۔۔ تم زخمیوں کی حفاظت کرو۔۔۔ گوری تہذیب کی حفاظت کے لیے ہم تعینات کیے گئے ہیں۔

لیکن یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ وہ رات تو بہت اندھیری تھی جس میں استوکمی سیپی نے تماحول کی بستی میں پہلا پتھر اٹھایا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ گھر پر، دو کمروں کی پھوس کی جھونپڑی کو اگر گھر کہا جاسکے تو اُس گھر پر سوتیلے باپ نے اُس کی ماں کو بہت مارا تھا۔ الزام یہ تھا کہ استوکمی سوویتو میں میں چل رہی بغاوت میں شامل ہوا تھا۔ سوتیلا باپ اُس کی ماں کو پیٹتے ہوئے چیخ رہا تھا ـــــ آزادی اور برابری میں بھی چاہتا ہوں۔۔۔ لیکن اُس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ جان خطرے میں ڈالی جائے۔ تو کتنا ایندھن چولہے میں ڈالتی ہے؟ بتا۔ ضروری ہے کہ سارا ایندھن ایک بار ہی ڈال دیا جائے؟ اور بتا تیرا یہ استوکمی۔ بارہ برس کا چھوکرا استوکمی ـــــ وہاں ـــــ سوویتو کی بغاوت میں شامل ہونے گیا تھا۔۔۔ خود ہی نہیں، چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔

ماں سسک رہی تھی۔۔۔ بعد میں اُٹھ کر وہ کھانا نکالنے لگی تھی۔ اُس نے دونوں

بیٹوں کو آواز لگائی۔۔۔ لیکن استوبھی کا دل اچٹ چکا تھا۔ سوا کچھ برتنوں کی آواز کے اور کوئی آواز اُس رات کے پہلے پہر میں نہیں تھی۔

بس، رات بہت اندھیری تھی اور ماں کے مار کھانے کے بعد ڈراؤنی بھی ہو گئی تھی۔ جھاڑیاں اور جھرمٹ سستاتے ہوئے ہاتھیوں کی طرح اندھیرے میں ہانپ رہے تھے کہ تبھی بازار کے کیفے سے مریم مکیبا کی آواز آئی تھی۔ مریم مکیبا کے گیت کے الفاظ رہبانی ہوا پر تیرتے آئے تھے۔۔۔ جیوک باکس میں کسی نے سکہ ڈالا ہوگا! استوبھی بیچی کو مریم مکیبا کی آواز اور گیت بہت پسند ہیں۔ جب بھی کوئی لڑکا سکہ ہاتھ میں لے کر اپنی پسند کا گیت ڈھونڈتا تو استوبھی بیچی اسے مریم مکیبا کا گیت سننے کی ترغیب دیتا۔۔۔ اُس کے پاس تو پیسے ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ مریم مکیبا کے گیت پر وہ دل کھول کر ناچتا تھا۔۔۔ کیفے کے لوگ بھی اس کے ناچ میں مسحور ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی خود اٹھ کر بھی ناچنے لگتے تھے۔

اُس رات کیفے سے گیت کی آواز آئی تو استوبھی چپ چاپ بازار کی طرف نکل گیا۔ وہ گیت اسے کھینچ رہا تھا۔ راستے تو اس کے لیے جانے پہچانے تھے، اور پھر اتنے اوبڑ کھابڑ بھی نہیں۔ وہ تو تماحول میں ہی پیدا ہوا تھا لیکن دوسرے محلے میں رہتا تھا۔ جب اس کا باپ مرا تو وہ پانچ سال کا تھا۔ پھر ماں نے دوسری شادی کر لی تو وہ اس محلے میں چلا آیا۔

کیفے میں پہنچ کر استوبھی نے دیکھا ـــــ کوئی سات آٹھ لوگ وہاں جمع تھے۔ ان میں سے دو کو اُس نے پہچانا۔ وہ سوویتو کے انقلابی دنوں میں اُسے دکھائی دیے تھے۔ وہ تو یونہی گھومتا گھامتا وہاں پہنچا تھا۔۔۔ اُسے پتہ بھی نہیں تھا کہ انقلاب کیا ہوتا ہے۔۔۔ لیکن اُس نے دیکھا تھا۔۔۔ تمام لوگ ایک طرف تھے اور کچھ لوگ دوسری طرف۔ مین اسٹریٹ پر بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ ویسے تو دکانیں بند تھیں لیکن جو کھلی تھیں وہ دھڑا دھڑ بند ہوتی جا رہی تھیں۔۔۔ لوگ گھروں میں سے نکل کر ندی کی طرح مین اسٹریٹ پر امنڈ رہے تھے اور بجیلا سنتے کے دستے بندوقیں تانے شکاریوں کی طرح تیار کھڑے تھے۔ استوبھی کی سمجھ میں تب کچھ کچھ آنے لگا تھا۔ اس کا سوتیلا باپ سہمی آواز میں انھیں دستوں کی بات کیا کرتا تھا۔۔۔ ماں کو مارنے کے بعد وہ خود رویا کرتا تھا اور بعد میں اُسے سمجھاتا تھا کہ ڈر کی وجہ سے اُس کے اندر غصّے کا بھوت جاگتا ہے۔۔۔

"تمھیں کالوں سے ڈر لگتا ہے؟" ماں تب پوچھتی تھی ـــــ "کالوں کے اندر

کے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے؟"
"نہیں۔۔۔ کان میں کس بات کا ڈر! وہاں تو بہت آرام ہے، لیکن زمین پر آتے آتے جب بوٹوں کی یا گالیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، تب ڈر لگتا ہے۔" سوتیلا باپ تب بتاتا تھا۔
"گالیاں کون دیتا ہے، ٹھیکیدار؟" ماں آگے پوچھتی۔
"نہیں، ٹھیکیدار تو پیسہ اور شاباشی دیتا ہے۔۔۔ اگر دن بھر میں پچیس ٹرالی بجری ہم نے کاٹ لی تو وہ ساتھ بیٹھ کر کافی بھی پلاتا ہے۔۔۔ گالیاں تو بجیلانتے کے سپاہی دیتے ہیں۔" باپ بتاتا تھا۔
"لیکن تمھارا ٹھیکیدار تو گورا ہے!"
"تو اس سے کیا ہوا۔ ہر گورا تو کام چور یا بد معاش نہیں ہوتا۔۔۔ ہمارا ٹھیکیدار ہم سے کام لینا اور ہمیں خوش رکھنا جانتا ہے۔"
"تو سپاہی گالیاں کیوں دیتے ہیں؟"
"انھیں شک ہے کہ ہماری کانوں میں باغی پناہ پاتے ہیں۔۔۔ وہ بجیلانتے سے بچنے کے لیے کانوں میں چھپ جاتے ہیں اور ہم مزدور لوگ انھیں پناہ دیتے ہیں!"
"لیکن تمھارے پاس تو مزدور ہونے کے شناختی کارڈ رہتے ہیں۔ کیا وہ سپاہی تمھیں نہیں پہچانتے؟"
"ہمیں صرف نمبر سے پہچانا جاتا ہے۔۔۔ اگر نمبر ایک دم نہ بولا، یا یاد کرنے میں دیر لگی تو چپو تم کھاتے بجیلانتے کا بوٹ ہمارے۔۔۔"
"دھیرے بولو۔۔۔ جگہ بتانے کی ضرورت ہے کہ بوٹ کہاں پڑتا ہے۔۔۔ کچھ تو لحاظ کرو۔۔۔ بچے جاگ رہے ہیں۔"
"کیا بولی؟" شوہر غرایا تھا۔
"کہا نہ، دھیرے بولو!"
"حرامزادی! یہاں بھی دھیرے بولنے کو کہتی ہے۔ تیرے ایک لات لگاؤں وہاں پر۔۔۔ وہیں پر۔۔۔ جہاں۔۔۔ جہاں۔۔۔ میرے پڑی تھی۔"
اور باپ نے دو تین لاتیں ماں کو ماردی تھیں۔۔۔ ماں ایک دم چیخ کر کراہنے لگی

تھی۔۔۔اور پھر باپ بلک بلک کر رونے لگا تھا۔۔ماں کو سنبھالنے لگا تھا۔۔۔پھر ماں نے کھانا نکالا تھا۔ ریت کے کیکڑوں کا شوربہ اور جو کی روٹی، جو وہ تین دن پہلے نان بائی کی دکان سے لائی تھی۔

ریت کے کیکڑے پکڑنے میں استوبھی ماہر تھا۔ اگر ہوا نہ چل رہی ہو تو ریت پر چلنے کے نشان کچھ دیر بنے رہتے ہیں اور پھر وہ سوراخ تو دکھائی پڑ ہی جاتے ہیں جن میں وہ ٹیڑھے ہو کر داخل ہو جاتے ہیں۔۔۔وہ سمندر کے کیکڑوں کی طرح کالے نہیں ہوتے، وہ ریت کی طرح ہی شربتی ہوتے ہیں۔۔۔کبھی کبھی تو کسی سوراخ کو کھودنے سے کیکڑوں کی پوری بستی ہی مل جاتی ہے۔۔۔خوفزدہ کیکڑے تب بھاگتے ہیں۔۔۔کچھ رہ جاتے ہیں، کچھ ریت میں راستے بنا کر اندر چھپ جاتے ہیں۔

اُس رات کھانے کے بعد جب باپ نے ماں کو سیدھا لٹا لیا تھا اور اس کی دونوں ٹانگوں کو پھیلا کر وہ اُس جگہ کو سینکتا رہا تھا جہاں اُس نے ماں کو مارا تھا اور خود بھی اپنی اُس جگہ کو سینکتا رہا تھا جہاں اُسے بجیلا نتے نے مارا تھا۔

سینکنے کے لیے باپ نے لیمپ کی لو بہت اونچی کر لی تھی، اسی سے لیمپ کا شیشہ چٹخ گیا تھا تو ماں نے اُسے کوسا تھا، "درد تو ٹھیک ہو جائے گا لیکن یہ شیشہ کہاں سے آئے گا؟"

لمبی لو کی وجہ سے شیشہ تو اُن کے جسم کی طرح کالا پڑ گیا تھا، لیکن اُس کی چٹخ بلیڈ کے دھار کی طرح چمکنے لگی تھی۔

صبح اپنے باپ کو بتائے بغیر استوبھی کانوں کے علاقے میں گیا تھا۔۔۔یونہی گھومتا ہوا، پاس جانے کی ہمت تو نہیں تھی۔۔۔کانوں کے الگ الگ علاقے چار دیواروں یا کانٹے دار تاروں سے گھرے ہوئے تھے۔۔۔گیٹ پر نئے مزدور بھرتی کے لیے کھڑے تھے۔۔۔اپنے اپنے سٹیزن پاس لیے ہوئے۔ سنتری انھیں روکے ہوئے تھے۔

استوبھی پاس تک تو نہیں جا سکا اس لیے وہ ایک ٹیلے پر چڑھ کر دیکھتا رہا تھا۔۔۔کانوں کے دہانے چھوٹے چھوٹے سوراخوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے اور ان میں اترنے والے مزدور کیکڑوں کی طرح غائب ہوتے جا رہے تھے۔ کٹی ہوئی بجری لے کر آنے والی ٹرالیاں تو بہت بعد میں اوپر آتی ہیں۔ مزدور تو کیکڑوں کی طرح نیچے ہی چھپے رہتے ہیں۔

لیکن اس دن استوبھی نے مین اسٹریٹ میں لوگوں کو زمین کے اوپر دیکھا تھا۔ تب

وہ کچھ کچھ سمجھ سکا تھا اور تبھی اپنے سوتیلے باپ کے لیے اس کے دل میں کچھ اپنا پن سا ابھرا تھا۔۔۔

اور تبھی استوہمی نے بجیلا نتے کے شکاری سپاہیوں کو آنکھ اٹھا کر دیکھا تھا۔۔۔ اور دوڑ کر بھیڑ کے آگے کھڑا ہو گیا تھا۔ اُسے دیکھ کر تماشائی بچے بھی دھیرے دھیرے بھیڑ کے آگے آ گئے تھے اور امنڈتی ندی کی پہلی لہر کی طرح بجیلا نتے کے دستوں کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔

انقلابی تحریک کے نیتا نے چیخ کر کہا تھا، "بچوں کو پیچھے ہٹاؤ۔ یہ کہاں سے آ گئے؟"

تو اُسی نے بزرگ ساتھی سے کہا تھا، "نہیں! یہ دس دس، بارہ بارہ برس کے بچے ہم سے زیادہ ہمت والے ہیں۔ ان کے پاس صرف مستقبل ہے۔۔۔ انھیں صرف پانا ہے، کچھ کھونا نہیں۔ ہمارا حال ہمیں بزدل بنا سکتا ہے۔۔۔ انھیں نہیں۔۔۔ ان کے پاس صرف مستقبل ہے۔"

اور اس کے بعد کیا ہوا یہ تو استوہمی کو بھی نہیں معلوم۔۔۔ اُسے تو ہوش تب آیا جب اس نے اپنے آپ کو ڈیٹنشن الاک اپ میں پایا۔ مار کاٹ کے بعد اُس کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی، لیکن اُس کے جسم میں جگہ جگہ درد تھا۔ تب اسے گھر کا لیمپ بہت یاد آیا تھا اور خواب میں اُس نے دیکھا تھا ــــ اُس کا سوتیلا باپ اُسے جگہ جگہ اسی طرح سے سینک رہا تھا جیسے اُس نے ماں کو سینکا تھا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا ــــ ڈیٹنشن وارڈ میں اندھیرا تھا۔ وہاں کوئی لیمپ نہیں تھا، اور نہ کوئی لو۔۔۔

دو مہینے بعد استوہمی کو دو تھپڑ مار کر چھوڑ دیا گیا۔ ڈیٹنشن کیمپ کا جیلر راؤنڈ پر آیا تو استوہمی اور دوسرے سات بچوں کو دیکھ کر چیخا تھا ــــ ابے گدھو! نابالغوں کو بند کر کے رکھا ہے، برٹش قانون گریٹ برٹین میں چاہے نیست نابود ہو چکا ہو لیکن پر یوریا کی حکومت انسانی حقوق اور بنیادی قوانین کی ابھی بھی حفاظت کرتی ہے۔۔۔ نابالغوں کو ہم عدالت کی اجازت کے بغیر ڈیٹنشن میں نہیں رکھ سکتے۔ انھیں اسی وقت رہا کرو۔۔۔ نہیں تو انسانی حقوق کی پامالی کا تہمت ہم پر لگ جائے گا۔ انھیں چھوڑو۔۔۔ آزاد کرو۔۔۔ سفر کے پیسے دے کر انھیں گھر بھیجو۔۔۔ ابھی۔۔۔ فوراً۔۔۔

اور تب استو مپی چھوڑا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اب کیا کرے؟ گھر جائے یا کہیں رک جائے؟ اُسے اندازہ تھا کہ چھوٹے بھائی نے گھر لوٹ کر بتادیا ہوگا کہ وہ کہاں ہے۔۔۔

اور یہ بات دونوں کو معلوم ہو گئی تھی ـــــ ماں کو بھی اور سوتیلے باپ کو بھی، لیکن دونوں ایک دوسرے سے اس بات کو چھپاتے رہے تھے ـــــ اور استو مپی کے اِس طرح غائب ہونے کو اُس کے آوارہ ہو جانے کا نام دیتے رہے تھے اور یہی انھوں نے بجیلانتے کے دستے سے بھی کہا تھا، جو استو مپی کو پوچھتے ہوئے آیا تھا۔

"جی، اُس کا نام استو مپی ہے۔۔۔ عمر بارہ سال۔ وہ میرا سوتیلا بیٹا اور میری بیوی کا بیٹا ہے۔۔۔ وہ شروع سے ہی آوارہ لگ رہا ہے۔۔۔ گھر سے چیزیں چرا کر بھاگتا رہا ہے۔۔۔ جب بھوکا مرنے لگتا ہے تو لوٹ آتا ہے۔ اِس وقت ہمیں اُس کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ لوٹ کر اگر آیا تو ہم آپ کے پاس رپورٹ کریں گے۔ اُسے آپ کے سامنے حاضر کریں گے۔ اُس نے ہمیں بہت پریشان کر رکھا ہے۔۔۔ اور ساب! ہم تو ویسے بھی بہت پریشان لوگ ہیں۔"

بجیلانتے مطمئن ہو کر لوٹ گئے ـــــ ہی نوز ہز پاسٹ، پرزنٹ اینڈ فیوچر۔ ہم نے ان گنواروں کو مہذب بنایا، روزگار دیا اور چرچ دیا، انھیں ان کا خدا دیا۔

اور استو مپی جب تو ماحول میں لوٹ کر آیا تو وہ پہلے سیدھے چرچ گیا۔ کالے پادری نے اُسے پہچانا اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، "مائی سن! جو من اور تن سے آزاد نہیں ہے وہ کسی بھی مذہب کا بندہ نہیں ہے۔"

کالے پادری کی بات استو مپی سمجھ ہی نہیں پایا۔ اُس نے اُسی طرح آنکھیں پھاڑ کر کالے پادری کو دیکھا جیسے اُس نے مین اسٹریٹ میں بجیلانتے کے دستوں کو دیکھا تھا۔

وہ جھونپڑی نما چرچ سے باہر نکل آیا تھا۔۔۔ موم بتیوں کی روشنی میں کالا پادری بہت مطمئن سا مسکرا رہا تھا۔

دور کیفے سے تبھی مریم ملکیا کی پکارتی آواز آئی تھی اور استو مپی اُس طرف کھنچا چلا گیا تھا۔ جیوک باکس میں کسی نے سکہ ڈالا تھا اور مریم ملکیا کی آواز ایک دم پھوٹ پڑی تھی ـــــ

"آؤ پیار کرو۔۔۔

جسم کے لحاتی محبت سے نہیں۔۔۔

وہ بھی ضروری ہے ---
لیکن پہلے دھرتی سے پیار کرو ---
اس کے جنگلوں، کچھاروں اور ہوا سے پیار کرو ---
جب تک جنگل پہاڑ اور ہوا آزاد نہیں ہیں
تب تک تمھارا تن بھی آزاد نہیں ہے
فانی تن کو آزاد کرو ---
آؤ پیار کرو --- آؤ پیار کرو!"

لفظ اور معنی استومپی کی سمجھ میں نہیں آتے تھے لیکن مریم مکیپائی آواز کی معنی میں ایک کشش تھی --- وہ پکارتی آواز اُسے کھینچتی تھی ---

مریم مکیپائی کی آواز کے درمیان اسے بجلیاں بننے کے دستے اور کالے پادری کے راحت دیتے اقوال ایک جیسے لگتے تھے۔ کالے پادری کے اقوال آزادی کی امید دیتے سہتے اور سہتے جانے کی سیکھ دیتے تھے۔

لیکن یہ اُس کے سوتیلے باپ نے نہیں کیا۔ اس نے استومپی کو بانہوں میں لیے ہوئے اتنا ہی کہا، "استومپی بیٹے! میں وہی چاہتا ہوں جو تم چاہتے ہو --- لیکن میں تمھیں کھونا نہیں چاہتا۔ تمھاری ماں بھی تمھیں کھونا نہیں چاہتی --- جس دن تم کھو جاؤ گے --- ہم دونوں اجنبی ہو جائیں گے۔ ہم تمھارا کھو جانا --- تمھارا ختم ہو جانا برداشت نہیں کر پائیں گے۔ تم بچوں کے باغی فوج میں سب سے آگے ہو --- لیکن ---"

اس لیکن کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ استومپی نے اپنے سوتیلے باپ سے پوچھا، "لیکن؟"

"لیکن --- یہی کہ تم بغاوت --- اس انقلاب کے پیچھے رہو۔ تم ابھی بارہ سال کے ہو --- بہت بڑی عمر ہے تمھارے پاس۔"

"وہ مجھے اس عمر پر روکے رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ مجھے اس عمر سے آگے بڑھنے نہیں دیں گے۔"

"استومپی! تم اپنی عمر سے زیادہ بڑی بات کر رہے ہو!" باپ چیخا تھا۔

"ظلم اور ناانصافی سہنے والوں کی عمر ہمیشہ برابر ہوتی ہے۔" استومپی نے بزرگوں

کی طرح چیخ کر کہا تھا، "میں زیادہ نہیں جانتا، لیکن جب آپ ماں کو مارتے ہیں تو میں جانتا ہوں وہ مار کہاں سے آتی ہے۔۔۔"

اور یہی وہ رات تھی جو اندھیری اور ڈراونی تھی جب بجیلا منتے ٹیم کے بوٹ ریت یا دھول کے کارپیٹ پر سپ سپ کر رہے تھے اور کبھی کبھی مینڈک نما بیٹھے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ٹکرا جاتے تھے۔

مینڈکوں کی طرح زمین پر بیٹھے ہوئے یہ پتھر رات میں کیسے اڑنے لگے تھے، یہ اسرار بجیلا منتے کے گشتی دستوں کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

استوپی تو تب مریم مکلیا کا گیت سن رہا تھا۔۔۔ تبھی ایک آدمی دوڑتا آیا تھا اور اس نے کیفے کے مالک سے ہانپتے ہوئے کہا تھا، "بتی بجھادو۔۔۔ وہ آرہے ہیں۔" کیفے کی بتی فوراً گل ہو گئی تھی اور اس اندھیرے میں کچھ لوگ ادھر ادھر نکل گئے تھے۔ جیوک باکس سے تھوڑی سی ہلکی روشنی آرہی تھی۔ آخر وہ روشنی بھی بند کر دی گئی اور گیت کی آواز بھی یکبارگی بیچ میں ٹوٹ گئی۔

استوپی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اندھیرے میں پڑی ایک بینچ پر وہ بیٹھ گیا تھا۔ تبھی بجیلا منتے کا ایک دستہ آیا تھا۔۔۔

اُن کے ہاتھوں میں کانوں کی ٹارچیں تھیں اور وہ کیفے میں لوگوں کو ایسے تلاش کر رہے تھے جیسے کانوں میں کیڑے تلاش کر رہے ہوں۔ اپنی جلد بازی میں انھوں نے کیفے کے مالک کو بری طرح پیٹا تھا۔۔۔ بجلی کے تار کاٹ دیے تھے، سارے برتن پھوڑ دیے تھے اور جیوک باکس توڑ دیا تھا۔

جب وہ لوٹ رہے تھے تو ایک اڑتا ہوا پتھر آیا تھا۔ پھر بہت سے پتھر اڑتے ہوئے آئے تھے اور کیڈٹ تھری زیرو ون کی کنپٹی سے خون بہنے لگا تھا۔ آنکھیں سوج گئی تھیں۔

اُن کے پاس معلومات تھیں۔۔۔ کیڈٹ تھری زیرو ون کو چوکی پر جمع کر کے وہ استوپی کے گھر پہنچے تھے۔ انھوں نے بوٹوں سے دستک دے کر اس کے باپ اور ماں کو جگایا تھا۔ چھوٹا بھائی اندھیرے میں دبک گیا تھا۔ ایک نے آگے بڑھ کر کہا تھا، "استوپی کو باہر نکالو۔"

کان کی ٹارچ ہاتھ میں دیکھ کر اس کا باپ تو پہلے ہی سمجھا تھا کہ ٹھیکیدار آیا

ہے۔۔۔ لیکن اِس وقت تو وہ کبھی نہیں آتا۔ باپ سب سمجھ گیا تھا۔

"استومپی تو گھر میں نہیں ہے۔ وہ کھانے کے وقت بھی نہیں تھا۔ پتہ نہیں سب کہاں بھاگ جاتا ہے۔۔۔ ایک دم آوارہ ہو گیا ہے۔"

"وہ آوارہ ہی نہیں، خطرناک ہو گیا ہے۔۔۔ اُس نے ڈیڑھ ہزار بچوں کو پتھر مارنا سکھایا ہے۔" بجیلانتے کا سربراہ چیخا تھا۔

"یہ تو وہ بچپن سے مارتا تھا۔" پیچھے کھڑی ماں نے دبی آواز میں کہا تھا، "بچپن میں وہ مینڈکوں کو پتھر مارا کرتا تھا۔۔۔ تب بھی وہ بہت شیطان تھا۔۔۔"

"اب وہ پورا شیطان ہو گیا۔۔۔ ڈیول۔ وہ جب بھی گھر آئے، ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ تم روز چوکی پر آکر حاضری دیا کرو۔۔۔ شام ہوتے ہی۔"

حکم دے کر بجیلانتے لوٹ گئے تھے۔

لیکن اُس دن سے استومپی گھر نہیں لوٹا۔ ماں کبھی کبھی روتی تھی، "اسے ماں کی یاد بھی نہیں آتی۔۔۔" سوتیلا باپ بھی پچھتا تھا، "وہ کبھی چھپ کر مجھ سے ملنے ہی چلا آتا۔۔۔"

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہی ہوا جو ایسے میں ہوتا ہے۔ وہ رات بھی اندھیری تھی۔ بجیلانتے کے بوٹوں کی آواز سے دہشت اور بڑھ گئی تھی۔۔۔ پھر چرچ کی جھونپڑی کے پیچھے گولیاں چلی تھیں۔ کالا پادری گھبرا کر باہر آیا تھا۔ تماحول کی بستی کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

بری طرح سے زخمی استومپی خون کی مٹ میلی چادر پر تڑپ رہا تھا۔

ڈر سے تھر تھر کانپتی چرچ کی بوڑھیا ٹیچر ایک موم بتی تھامے پاس آئی تھی اور اُسے دیکھتے ہی ڈری آواز میں چیخ پڑی تھی، "یہ تو استومپی ہے۔ اس بچے کو انھوں نے کیوں مار ڈالا۔"

پادری کے چہرے پر عبادت کی اداسی تھی۔

بوڑھیا ٹیچر نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے پادری سے کہا تھا، "استومپی کے گھر والوں کو خبر کر دو۔۔۔ یہ صرف پانچ سات منٹ کا مہمان ہے۔۔۔"

"نہیں! کسی کو خبر مت کرو۔۔۔" کراہتے ہوئے استومپی بولا تھا۔ تب تک پادری مقدس پانی لے آیا تھا۔

"خبر کرنا تو ضروری ہے۔۔۔" پادری بولا تھا۔

"نہیں!" ٹوٹتی آواز میں استومپی نے کہا تھا، "میری ماں سنے گی تو روئے گی۔۔۔ اُسے مت بتانا کہ میں مارا گیا ہوں۔ اُس سے یہی کہنا کہ میں ڈیٹنشن میں ہوں۔۔۔ مجھے بجیلا سنتے نے پکڑ لیا ہے۔۔۔"

"مائی سن!" پادری کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"مجھے چپ چاپ یہیں کہیں دفن کر دینا۔۔۔ مگر میری ماں۔۔۔ میرے باپ کو مت بتانا۔۔۔ اُنھیں یہی بتانا ــــ میں ڈیٹنشن میں ہوں۔۔۔ تب وہ روئیں گے نہیں، میرا انتظار کریں گے۔۔۔"

"یس مائی سن! جیسس کرائسٹ نے بھی یہی کہا ہے ــــ میں انسانی جسم اختیار کر کے پھر زمین پر آؤں گا۔۔۔ میرا انتظار کرنا۔۔۔"

"مجھے جیسس کرائسٹ کا انتظار نہیں ہے فادر۔۔۔" کہتے کہتے استومپی کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔

بوڑھی ٹیچر نے موم بتی کی کانپتی لَو میں پاس جا کر دیکھا اور کسمسا کر وہیں بیٹھ گئی۔

کالے پادری نے اندھیرے میں ہی کراس بنایا۔

خون کی چادر میں استومپی پڑا تھا۔

اُس کی پلکیں بند کرنے سے پہلے پادری نے ایک بار اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔۔۔ تو بوڑھی ٹیچر نے موم بتی اور پاس کر دی۔ پھر اس نے دھیرے سے سرگوشی میں پوچھا، "اِسے کس کا انتظار تھا؟"

"پتہ نہیں!"

دلّی میں ایک موت

چاروں طرف کہرہ طاری ہے۔ صبح کے نو بجے ہیں، لیکن پوری دلّی دھند میں لپٹی ہوئی ہے، سڑکیں نم ہیں، درخت بھیگے ہوئے ہیں، کچھ صاف نظر نہیں آتا۔ زندگی کی ہل چل کا پتہ آوازوں سے لگ رہا ہے۔ یہ آوازیں کانوں میں بس گئی ہیں۔ گھر کے ہر حصے سے آوازیں آرہی ہیں۔ واسوانی کے نوکر نے حسب معمول اسٹوو جلالیا ہے۔ اس کی سنسناہٹ دیوار کے پار سے آرہی ہے۔ بغل والے کمرے میں اٹل موانی جوتے پر پالش کر رہا ہے۔ اوپر سردار جی مونچھوں پر فلسو لگا رہے ہیں۔ اُن کی کھڑکی کے پردے کے پار جلتا ہوا بلب بڑے موتی کی مانند چمک رہا ہے۔ سب دروازے بند ہیں۔ سب کھڑکیوں پر پردے ہیں لیکن ہر حصے میں زندگی کی کھنک ہے۔ سہ منزلے پر واسوانی نے باتھ روم کا دروازہ بند کیا ہے اور پائپ کھول لیا ہے۔۔۔

کہرے میں بسیں دوڑ رہی ہیں۔ جوں جوں کرتے بھاری ٹائروں کی آوازیں دور سے نزدیک آتی ہیں اور پھر دور ہو جاتی ہیں۔ موٹر رکشے بے تحاشہ بھاگے چلے جارہے ہیں۔ ٹیکسی کا میٹر ابھی کسی نے ڈاؤن کیا ہے۔ پڑوس کے ڈاکٹروں کے ہاں فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور پھر پچھواڑے کی گلی سے گزرتی ہوئی کچھ لڑکیاں صبح کی شفٹ پر جارہی ہیں۔

سخت سردی ہے۔ سڑکیں ٹھٹھری ہوئی ہیں اور کہرے کے بادلوں کو چیرتی ہوئی کاریں اور بسیں ہارن بجاتی ہوئی بھاگ رہی ہیں۔ سڑکوں اور پٹریوں پر بھیڑ ہے لیکن کہرے میں لپٹا ہوا ہر آدمی بھٹکی ہوئی روح کی طرح معلوم ہو رہا ہے۔

وہ روحیں خاموش دھند کے سمندر میں بڑھتی جا رہی ہیں۔۔۔ بسوں میں بھیڑ ہے لوگ ٹھنڈی ٹھنڈی سیٹوں پر سکڑے ہوئے بیٹھے ہیں اور کچھ لوگ درمیان ہی میں حضرت عیسیٰ کی طرح صلیب پر لٹکے ہوئے ہیں۔ بانہیں پسارے انکی ہتھیلیوں میں کیلیں نہیں ہیں۔ بس کی برفیلی چمکدار چھڑیں ہیں۔

اور ایسے میں دور سے ایک ارتھی کی خبر اخبار میں ہے۔ میں نے ابھی ابھی پڑھی ہے، اسی موت کی خبر ہوگی۔ اخبار میں چھپا ہے۔ آج رات قرول باغ کے مشہور اور مقبول بزنس میگنٹ سیٹھ دیوان چندر جی کی موت ارون ہسپتال میں ہو گئی۔ اُن کی لاش کوٹھی پہ لائی گئی ہے۔ کل صبح نو بجے اُن کی ارتھی آریہ سماج روڈ سے ہوتی ہوئی پنچ کوئیاں شمشان بھومی میں داہ سنسکار کے لیے جائے گی۔

اور اس وقت سڑک پہ آتی ہوئی یہ ارتھی انھیں کی ہوگی۔ کچھ لوگ ٹوپیاں لگائے اور مفلر باندھے ہوئے خاموشی سے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ اُن کی چال بہت دھیمی ہے۔ کچھ دکھائی پڑ رہا ہے۔ کچھ نہیں دکھائی پڑ رہا ہے لیکن مجھے یوں لگتا ہے کہ ارتھی کے پیچھے کچھ آدمی ہیں۔

میرے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ میں اخبار ایک طرف رکھ کر دروازہ کھولتا ہوں۔ اتل موانی سامنے کھڑا ہے۔

"یار، کیا مصیبت ہے آج کوئی آئرن کرنے والا بھی نہیں آیا۔ ذرا اپنا آئرن دینا۔"

اتل کہتا ہے تو مجھے تسلی ہوتی ہے۔ نہیں تو اس کا چہرہ دیکھتے ہی مجھے خدشہ ہوا تھا کہ کہیں میت کے ساتھ جانے کا وبال نہ کھڑا کر دے۔ میں اُس کو فوراً آئرن دے دیتا ہوں اور بے فکر ہو جاتا ہوں کہ اتل اپنی پینٹ پر لوہا کرے گا اور سفارت خانوں کے چکر کاٹنے نکل جائے گا۔

جب سے میں نے اخبار میں سیٹھ دیوان چندر کی موت کی خبر پڑھی تھی مجھے ہر لمحہ یہی اندیشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی آکر اس سردی میں میت کے ساتھ جانے کی بات نہ کہہ دے۔ بلڈنگ کے سبھی لوگ اُن سے واقف تھے اور سبھی شریف و دنیادار آدمی تھے۔

تبھی سردار جی کا نوکر زینے سے بھڑ بھڑاتا ہوا آیا اور دروازہ کھول کر باہر جانے لگا۔ اپنے دل کو مزید سہارا دینے کے لیے میں نے پکارا!

"دھرما! کہاں جا رہا ہے؟"

"سردار جی کے لیے مکھن لینے۔" اس نے وہیں سے جواب دیا تو لگے ہاتھوں لپک

کر میں نے بھی اپنی سگریٹ منگوانے کے لیے اس کو پیسے تھما دیے۔

سردار جی ناشتے کے لیے مکھن منگوا رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی میت میں شریک نہیں ہو رہے ہیں۔ مجھے کچھ اور راحت ملی۔ جب اتل موانی اور سردار جی کا ارادہ میت کے ساتھ جانے کا نہیں ہے تو میرا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ان دونوں کا یا واسوانی خاندان کا ہی سیٹھ دیوان چندر کے ہاں زیادہ آنا جانا تھا۔ میری تو چار پانچ بار کی ملاقات تھی۔ اگر یہ لوگ ہی شامل نہیں ہو رہے ہیں تو میرا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

سامنے بالکونی پہ مجھے مسز واسوانی دکھائی پڑتی ہیں۔ اُن کے خوبصورت چہرے پہ عجیب سی سفیدی ہے اور ہونٹوں پہ گزشتہ شام کی لپ اسٹک کی ہلکی سرخی اب بھی موجود ہے۔ گاؤن پہنے ہوئے ہی نکلی ہیں اور اپنا جوڑا باندھ رہی ہیں۔ اُن کی آواز سنائی پڑتی ہے۔

"ڈارلنگ ذرا مجھے پیسٹ دینا پلیز۔"

مجھے اور راحت ملتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مسز واسوانی بھی میت میں شریک نہیں ہو رہی ہیں۔

دور آر یہ سانی روڈ پر ارتھی آہستہ آہستہ بڑھتی آ رہی ہے۔۔۔

اتل موانی مجھے آئرن لوٹانے آتا ہے۔ میں آئرن لے کر دروازہ بند کر لینا چاہتا ہوں لیکن وہ اندر آ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے، "تم نے سنا، دیوان چندر کی کل موت ہو گئی؟"

"میں نے ابھی اخبار میں پڑھا ہے۔" میں سیدھا سا جواب دیتا ہوں تاکہ موت کی بات آگے نہ بڑھے! اتل موانی کے چہرے پر سفیدی چمک رہی ہے۔ وہ شیو کر چکا ہے۔ وہ آگے کہتا ہے، "بڑے بھلے آدمی تھے دیوان چند۔"

یہ سن کر مجھے لگتا ہے کہ اگر بات آگے بڑھ گئی تو ابھی میت میں شریک ہونے کی اخلاقی ذمہ داری ہو جائے گی۔ لہٰذا میں کہتا ہوں، "تمھارے اُس کام کا کیا ہوا؟"

"بس مشین آنے بھر کی دیر ہے۔ آتے ہی اپنا کمیشن تو کھڑا ہو جائے گا۔ یہ کمیشن کا کام بھی بڑا بیہودہ ہے لیکن کیا کیا جائے۔ آٹھ دس مشینیں میرے تھرو نکل گئیں تو اپنا بزنس شروع کروں گا،" اتل موانی کہہ رہا ہے۔

"بھئی شروع شروع میں جب میں یہاں آیا تھا تو دیوان چند جی نے بڑی مدد کی تھی میری۔ انھیں کی وجہ سے کچھ کام دھام مل گیا تھا۔ لوگ بہت مانتے تھے انھیں۔"

پھر دیوان چند کا نام سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تبھی کھڑکی سے سردار جی سر نکال کر پوچھنے لگتے ہیں۔

"مسٹر موانی کتنے بجے چلنا ہے؟"

"وقت تو نو بجے کا تھا۔ شاید کہرے اور سردی کی وجہ سے کچھ دیر ہو جائے،" وہ کہہ رہا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ یہ بات میت کے متعلق ہی ہے۔

سردار جی کا نوکر دھرما مجھے سگریٹ دے کر جا چکا ہے اور اوپر میز پر چائے لگا رہا ہے۔ تبھی مسز واسوانی کی آواز سنائی پڑتی ہے، "میرے خیال سے پرمیلا وہاں ضرور پہنچے گی۔ کیوں ڈارلنگ؟"

"پہنچنا تو چاہیے۔ تم ذرا جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" کہتے ہوئے مسٹر واسوانی بالکونی سے گزر گئے۔

اٹل مجھ سے پوچھ رہا ہے، "شام کو کافی ہاؤس کی طرف آنا ہوگا؟"

"شاید چلا آؤں،" کہتے ہوئے میں کمبل لپیٹ لیتا ہوں اور وہ واپس اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ آدھ منٹ بعد ہی اس کی آواز پھر آتی ہے، "بھئی بجلی آ رہی ہے؟"

میں جواب دے دیتا ہوں، "ہاں آ رہی ہے۔" میں جانتا ہوں کہ وہ الیکٹرک راڈ سے پانی گرم کر رہا ہے۔ اس لیے اُس نے پوچھا ہے۔

"پالش!" بوٹ پالش والا لڑکا ہر روز کی مانند ادب سے آواز لگاتا ہے اور سردار جی اُس کو اوپر پکار لیتے ہیں۔ لڑکا بیٹھ کا پالش کرنے لگتا ہے اور وہ اپنے نوکر کو ہدایتیں دے رہے ہیں۔ "کھانا ٹھیک ایک بجے لے کر آنا۔۔۔ پاپڑ بھون کر لانا اور سلاد بھی بنا لینا۔۔۔"

میں جانتا ہوں سردار جی کا نوکر پاجی ہے، وہ وقت سے کبھی کھانا نہیں پہنچاتا اور نہ اُن کی طبیعت کی چیز ہی پکاتا ہے۔

باہر سڑک پر کہرہ اب بھی گہرا ہے۔ سورج کی کرنوں کا پتہ نہیں ہے۔ کلچے چھولے والے وشنو نے اپنی ریڑھی لا کر کھڑی کر لی ہے۔ حسب معمول وہ پلیٹیں بجا رہا ہے۔ اُن کی کھنکھناہٹ کی آواز آ رہی ہے۔

سات نمبر کی بس چھوٹ رہی ہے۔ سولیوں پر لٹکے بہت سے عیسیٰ اس میں چلے جا رہے ہیں۔ اور کیو میں کھڑے دوسرے لوگوں کو کنڈکٹر پیشگی ٹکٹ بانٹ رہا ہے۔ ہر بار

جب بھی وہ پیسے واپس کرتا ہے تو ریزگاری کی کھنک یہاں تک آتی ہے۔ دھند میں لپٹی روحوں کے درمیان کالی وردی والا کنڈکٹر شیطان کی طرح لگ رہا ہے۔

اور ارتھی اب کچھ اور قریب آگئی ہے۔

"نیلی ساڑی پہن لوں،" مسز واسوانی پوچھ رہی ہیں۔

واسوانی کے جواب دینے کی گھٹی گھٹی آواز سے لگ رہا ہے کہ وہ ٹائی کی ناٹ درست کر رہا ہے۔

سردار جی کے نوکر نے انکا سوٹ برش سے صاف کر کے ہینگر پر لٹکا دیا ہے اور سردار جی شیشے کے سامنے کھڑے پگڑی باندھ رہے ہیں۔

اتل مِوانی پھر میرے سامنے سے نکلا ہے۔ پورٹ فولیو اس کے ہاتھ میں ہے۔ پچھلے ماہ بنوایا ہوا سوٹ اس نے پہن رکھا ہے اس کے چہرے پر تازگی ہے اور جوتوں پر چمک آتے ہی وہ مجھ سے پوچھتا ہے، "تم نہیں چل رہے ہو؟" اور میں جب تک پوچھوں کہ کہاں چلنے کو پوچھ رہا ہے کہ وہ سردار جی کو آواز لگاتا ہے، "آیئے سردار جی! اب دیر ہو رہی ہے۔ دس بج چکا ہے۔"

دو منٹ بعد ہی سردار جی تیار ہو کر نیچے آتے ہیں کہ واسوانی اوپر سے موانی کا سوٹ دیکھ کر پوچھتا ہے، "یہ سوٹ کدھر سلوایا ہے؟"

"اُدھر خان مارکیٹ میں!"

"بہت اچھا سلا ہے۔ ٹیلر کا پتہ ہمیں بھی دینا۔" پھر وہ اپنی مسز کو پکارتا ہے، "اب جاؤ ڈیر۔۔۔ اچھا میں نیچے کھڑا ہوں۔ تم آؤ۔" کہتا ہوا وہ بھی موانی اور سردار جی کے پاس آجاتا ہے اور سوٹ کو ہاتھ لگاتے ہوئے پوچھتا ہے۔

"اا ننگ اینڈین ہے؟"

"انگلش۔"

"بہت اچھی فٹنگ ہے،" کہتے ہوئے وہ ٹیلر کا پتہ ڈائری میں نوٹ کرتا ہے۔ مسز واسوانی بالکونی پر دکھائی پڑتی ہے۔ نم اور سرد صبح میں اس کی خوبصورتی اور بھی نکھر آئی ہے۔ سردار جی آہستہ سے موانی کو آنکھ کا اشارہ کر کے سیٹی بجانے لگتے ہیں۔

ارتھی اب سڑک پر ٹھیک میرے کمرے کے نیچے ہے۔ اُس کے ساتھ چند آدمی

ہیں۔ ایک دو کاریں بھی ہیں جو دھیرے دھیرے رینگ رہی ہیں۔ لوگ باتوں میں مشغول ہیں۔

مسز واسوانی جوڑے میں پھول لگائے ہوئے نیچے اترتی ہیں تو سردار جی اپنی جیب کا رومال ٹھیک لگاتے ہیں اور اس سے پیشتر کہ وہ لوگ باہر جائیں واسوانی مجھ سے پوچھتا ہے، "آپ نہیں چل رہے ہیں؟"

"آپ چلیے۔ میں آرہا ہوں،" میں کہتا ہوں مگر دوسرے ہی لمحے مجھے لگتا ہے کہ اُس نے مجھ سے کہاں چلنے کو کہا ہے؟ میں ابھی کھڑا سوچ ہی رہا ہوں کہ وہ چاروں گھر کے باہر ہو جاتے ہیں۔

ارتھی کچھ اور آگے نکل گئی ہے۔ ایک کار پیچھے سے آتی ہے اور ارتھی کے قریب آہستہ ہو جاتی ہے۔ چلانے والے صاحب میت میں پیدال چلنے والے آدمی سے کچھ بات کرتے ہیں اور پھر کار میت سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ ارتھی کے ساتھ پیچھے چلنے والی دونوں کاریں بھی اُسی کار کے پیچھے سرسراتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔

مسز واسوانی اور وہ تینوں لوگ ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب جا رہے ہیں۔ میں انھیں دیکھتا رہتا ہوں۔ مسز واسوانی نے فر کالر ڈال رکھا ہے اور شاید سردار جی اپنے چمڑے کے دستانے انھیں دے رہے ہیں یا دکھا رہے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور آگے بڑھ کر دروازہ کھولتا ہے اور وہ چاروں ٹیکسی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اب ٹیکسی اِدھر ہی آرہی ہے اور اس میں سے کھلکھلانے کی آواز مجھے سنائی دے رہی ہے۔ واسوانی آگے سڑک پر جاتی ارتھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈرائیور کو کچھ بتا رہا ہے۔

میں خاموش کھڑا سب دیکھ رہا ہوں اور اب نہ جانے کیوں مجھے دل میں لگ رہا ہے کہ دیوان چند کی میت میں کم از کم مجھے تو شامل ہو ہی جانا چاہیے تھا۔ ان کے لڑکے سے میری خاصی جان پہچان ہے اور ایسے موقعہ پہ تو دشمن کا ساتھ بھی دیا جاتا ہے۔ سردی کی وجہ سے میری ہمت جواب دے رہی ہے مگر دل میں کہیں شریک ہونے کی بات اندر ہی اندر سلگ رہی ہے۔

اُن چاروں کی ٹیکسی ارتھی کے قریب آہستہ ہوتی ہے۔ موانی گردن نکال کر کچھ کہتا ہے۔ اور داہنے سے راستہ کاٹتے ہوئے ٹیکسی آگے بڑھ جاتی ہے۔

مجھے دھچکا سا لگتا ہے اور میں اوور کوٹ پہن کر چپلیں ڈال کر نیچے اترتا ہوں۔ مجھے

میرے قدم خود بخود ارتھی کے قریب پہنچا دیتے ہیں۔ اور میں خاموش اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہوں۔ چار آدمی کندھا دیے ہوئے ہیں۔ اور سات آدمی ساتھ چل رہے ہیں۔ ساتواں میں ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ آدمی کے مرتے ہی کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔ پچھلے سال ہی دیوان چند نے اپنی لڑکی کی شادی کی تھی تو ہزاروں کی بھیڑ تھی۔ کوٹھی کے باہر کاروں کی لائن لگی ہوئی تھی۔

میں ارتھی کے ساتھ ساتھ لنک روڈ پر پہنچ چکا ہوں۔ اگلے روڈ پر ہی پنچ کوئیاں شمشان بھومی ہے۔

اور جیسے ہی ارتھی موڑ پر گھومتی ہے لوگوں کی بھیڑ اور کاروں کی قطار مجھے دکھائی دینے لگتی ہے۔ کچھ اسکوٹر بھی کھڑے ہیں۔ عورتوں کی بھیڑ ایک طرف کھڑی ہے۔ اُن کی باتوں کی اونچی آوازیں سنائی پڑ رہی ہیں۔ اُن کے کھڑے ہونے میں وہی لچک ہے جو کناٹ پلیس میں نظر آتی ہے۔ سب کے جوڑوں کے اسٹائل الگ الگ ہیں۔ مردوں کی بھیڑ سے سگریٹ کا دھواں اٹھ اٹھ کر کہرے میں گھلا جا رہا ہے اور گفتگو کرتی ہوئی عورتوں کے لال لال لب اور سفید دانت چمک رہے ہیں اور اُن کی آنکھوں میں ایک غرور ہے۔

ارتھی کو باہر بنے چبوترے پر رکھ دیا گیا ہے۔ اب خاموشی طاری ہے۔ اِدھر اُدھر بکھری ہوئی بھیڑ نعش کے ارد گرد جمع ہو گئی ہے اور کاروں کے شوفر ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے اور مالائیں لیے اپنے مالکوں کی نظروں کے منتظر ہیں۔

میری نظر واسوانی پر پڑتی ہے وہ اپنی مسز کو آنکھ کے اشارے سے میت کے قریب جانے کو کہہ رہا ہے اور وہ ہیں کہ ایک عورت کے ساتھ کھڑی بات کر رہی ہیں۔ سردار جی اور اتل موانی بھی وہیں کھڑے ہیں۔

نعش کا منہ کھول دیا گیا ہے اور اب عورتیں پھول مالائیں اُس کے ارد گرد رکھتی جا رہی ہیں۔ شوفر فارغ ہو کر اب کاروں کے پاس کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔

ایک خاتون مالا رکھ کر کوٹ کی جیب سے رومال نکالتی ہے اور آنکھوں پر رکھ کر ناک سڑ سڑانے لگتی ہیں اور پیچھے ہٹ آتی ہیں۔

اور اب سب عورتوں نے رومال نکال لیے ہیں اور ان کی ناکوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔

کچھ آدمیوں نے اگربتیاں جلا کر نعش کے سرہانے رکھ دی ہیں۔ وہ بے حس و حرکت کھڑے ہیں۔

آوازوں سے لگ رہا ہے کہ عورتوں کے دل کو زیادہ صدمہ پہنچا ہے۔

اٹل موانی اپنے پورٹ فولیو سے کوئی کاغذ نکال کر واسوانی کو دکھا رہا ہے۔ میرے خیال میں وہ پاسپورٹ کا فارم ہے۔

اب لاش کو اندر شمشان بھومی میں لے جایا جا رہا ہے۔ بھیڑ پھاٹک کے باہر کھڑی دیکھ رہی ہے۔

شوفروں نے سگریٹیں یا تو پی لی ہیں یا بجھا دی ہیں اور وہ اپنی اپنی کاروں کے پاس تعینات ہیں۔

نعش اب اندر پہنچ چکی ہے۔

ماتم پرسی کے لیے آئے ہوئے آدمی اور عورتیں اب باہر کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

کاروں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آرہی ہیں۔ اسکوٹر اسٹارٹ ہو رہے ہیں اور کچھ لوگ ریڈنگ روڈ بس اسٹاپ کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

کہرہ اب بھی گہرا ہے۔ سڑک سے بسیں گزر رہی ہیں اور مسز واسوانی کہہ رہی ہیں۔

"پرمیلا نے شام کو بلایا ہے، چلوگے ناڈیر؟ کار آجائے گی ٹھیک ہے نا؟"

واسوانی اثبات میں سر ہلا رہا ہے۔ کاروں میں جاتی ہوئی عورتیں مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے وداع ہو رہی ہیں اور بائی بائی کی چند آوازیں آرہی ہیں۔ کاریں اسٹارٹ ہو کر جا رہی ہیں۔

اٹل موانی اور سردار جی بھی ریڈنگ روڈ کی طرف بڑھ گئے ہیں اور میں کھڑا سوچ رہا ہوں کہ میں بھی تیار ہو کر آیا ہوتا تو یہیں سے سیدھا کام پر نکل جاتا لیکن اب تو ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔

چتا میں آگ لگا دی گئی ہے اور چار پانچ آدمی درخت کے نیچے پڑی بنچ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میری طرح وہ بھی یوں ہی چلے آئے ہیں۔ انھوں نے ضرور چھٹی لے رکھی ہوگی۔ ورنہ وہ بھی تیار ہو کر آتے۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ گھر جا کر تیار ہو کر دفتر جاؤں یا اب ایک موت کا بہانہ بنا کر آج چھٹی لے لوں۔ آخر موت تو ہوئی ہی ہے اور میں میت میں شریک بھی ہوا ہوں۔

ماس کا دریا

پورے معائنے کے بعد ڈاکٹر نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسے کوئی پوشیدہ مرض نہیں ہے۔ لیکن تپ دق کے آثار ضرور ہیں۔ اس نے ایک پرچہ بھی لکھ دیا تھا اور غذا کے لیے کچھ ہدایتیں بھی لکھ دی تھیں۔

کمیٹی پہلے ہی پیشے پر پابندی لگا چکی تھی۔ سب اپنی اپنی جگہ پریشان و فکر مند تھیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ ڈاکٹری معائنے نے بہتوں کے پیشے کو اور بھی ٹھپ کر دیا تھا۔ اس سے قبل ابراہیم ٹھیکیدار نے جنھیں الگ چھانٹ لیا تھا وہ سب پاس ہو گئی تھیں۔ اِن کے ناز و نخرے بہت بڑھ گئے تھے۔ اور وہ بڑے فخر و غرور سے اپنے خاندانوں کا ذکر کیا کرتی تھیں۔

ابراہیم نے جسمانی اعتبار سے چست و درست لڑکیاں چھانٹ لی تھیں۔ رفتہ رفتہ وہ شہر کے نسبتاً بہتر علاقوں میں رہائش پذیر ہو چکی تھیں۔ ابراہیم ان کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا اور جس ٹھیکے سے جتنی لڑکیاں لے گیا تھا، ان کی رقم مہینے کے مہینے بے باق کر جاتا تھا۔

ایک بار جب جگنو زیادہ پریشان تھی تو اُس نے بھی ابراہیم سے منت کی تھی کہ کسی ٹھور ٹھکانے پر بٹھا دے لیکن ابراہیم نے دو ٹوک جواب دے دیا تھا، "شادی بیاہ تو ہے نہیں کہ کسی کی آنکھ میں دھول جھونک کر گلے منڈھ دوں! جو آئے گا وہ تو بوٹی بوٹی دیکھ کر آئے گا۔" اور وہ کترا کر چلا گیا۔

اُس روز اُس کے دل پر پہلی بار گہری چوٹ لگی تھی۔ اب وہ اس لائق بھی نہیں

رہی؟ دوسری چوٹ تب لگی تھی جب ساتھ کے برامدے سے شہناز نے ہاتھ منکاتے ہوئے گالی دی تھی، "ارے اللہ تجھے وہ دن بھی دکھائے گا جب گاہک تیری سیڑھیوں پر قدم تک نہ رکھیں گے۔"

شہناز کی اس بات پر محلے میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ یہ گالی تو بری سے بری کو بھی نہیں دی جاتی۔۔۔ سب کے گاہک جیتے جاگتے رہیں۔ خدا مردوں کو روزی دے۔۔۔ ہاتھ پاؤں میں طاقت دے۔

اور اُسی دن پہلی بار جھجکتا ہوا وہ آیا تھا۔ فتنے اسے لایا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بڑا سا تھیلا تھا۔ خاکی پتلون اور نیلی قمیض میں ملبوس تھا۔ کانوں کے روؤں اور بھوؤں پر دھول کی ہلکی پرت تھی۔ کمرے میں جاکر جگنو کھاٹ پر خود بیٹھ گئی تھی، وہ گھبرایا گھبرایا سا کھڑا رہ گیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنا تھیلا کہاں رکھ دے۔ تبھی جگنو نے بڑی نرمی کے ساتھ تھیلا اُس کے ہاتھ سے لے کر سرہانے رکھ دیا تھا۔ وہ چپ چاپ کھاٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ قدرے توقف کے بعد جگنو نے کہا تھا، "جوتے اتار لو۔۔۔" اس نے کرمچ کے جوتے اتارے تھے تو بدبو کا ایک بھبکا سا اٹھا تھا۔۔۔ کچھ ویسا ہی جیسا کہ بہتوں کے کپڑے اتارنے پر اٹھا کرتا تھا۔۔۔ خاص طور سے اُس منسو کرانی سے پھوٹتا تھا جو رات گیارہ کے بعد ہی آیا کرتا تھا۔ اور فارغ ہونے کے بعد کمر میں درد کے سبب پتھر کی طرح بیٹھا رہ جاتا تھا۔ تب جگنو اُسے اٹھاتی تھی اور وہ رانیں کھجلاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ یا پھر کنور جیت ہوٹل والے کی طرح جو بدبودار تو تھا ہی اور اٹھنے سے قبل کھاٹ پر بیٹھ کر اوں اوں کر کے ڈکاریں لیتا تھا۔

وہ بھبک اُس سے برداشت نہ ہو سکی تو بولی، "جوتے پہن لو۔"

وہ جوتے پہن کر بیٹھ گیا تھا۔ تب اُسے بڑی کوفت ہوتی رہی تھی، پھر چڑھ کر بولی تھی، "یہ گھر کی بیٹھک نہیں ہے۔۔۔ فارغ ہو کر اپنا راستہ ناپو۔"

اُس نے اس جملے میں اپنی ہتک محسوس کی تھی اور خود کو سنبھالتے ہوئے سٹ پٹا کر بولا تھا، "تمہارا نام کیا ہے۔"

"جگنو!" وہ بولی تھی۔

"کہاں کی ہو؟"

"تم اپنا کام کرو۔" وہ پھر چڑھ گئی تھی۔

اور تب اس نے سچوں کی طرح ہی پوچھا تھا، "تمھیں یہ پیشہ پسند ہے؟"

"ہاں! تمھیں نہیں ہے؟" کہتے ہوئے وہ لیٹ گئی تھی۔ اس نے ساری رانوں تک کھینچ لی تھی۔ وہ بھی لیٹ گیا تھا اور بلاؤز کے اندر ہاتھ ڈالنے کی جھجکتے ہوئے کوشش کی تھی۔

"پریشان نہ کرو تو اچھا ہے۔۔۔" اس نے کہا تھا، "کیوں کھولتے ہو۔"

اب اُس کے لیے کچھ بھی کر سکنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ جگنو کے چہرے پر سستے پاؤڈر کی ڈوریاں سی بن گئی تھیں، ہونٹوں پر خون سوکھ کر چپک گیا تھا۔ کانوں کے آویزے مینڈک کی آنکھوں کی مانند بھرے ہوئے تھے۔ بال تیل سے بھیگے تھے۔ تکیہ نہایت غلیظ تھا۔ اور چادر کچلے ہوئے چنبیلی کے پھول کی طرح میلی تھی۔

تنگ کوٹھری میں عجیب سی بدبو بھری ہوئی تھی۔ ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا تھا اور تام چینی کا ایک ڈبہ۔ کونے میں کچھ چیتھڑے بھی پڑے ہوئے تھے۔

وہ پڑا ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ جگنو کے سرہانے ہی چھوٹی سی الماری تھی۔ اس کا پتھر تیل کے چکنے دھبوں سے اٹا ہوا تھا۔ ایک ٹوٹا ہوا کنگھا، سستی نیل پالش کی شیشی اور جوڑے کے کچھ پن اُس میں پڑے ہوئے تھے۔ الماری کی دیوار پر پنسل سے کچھ نام اور پتے تحریر تھے۔ فلمی گانوں کی کچھ کتابیں ایک کونے میں رکھی تھیں۔ انھیں کے پاس مردہ سانپوں کی مانند نقلی بالوں کی کچھ چوٹیاں پڑی تھیں۔ یہ سب دیکھتے دیکھتے اسے کراہت سی ہونے لگی تھی۔ اپنا دھیان بٹانے کے لیے اُس نے جگنو کی ران پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ جو باسی مچھلی کی طرح پلپلی اور کھدر کی طرح کھردری تھی۔ جگنو کے نیم برہنہ جسم سے کھوئے کی سی مہک آرہی تھی۔ اُس نے ہاتھ ہٹایا تو ران سے ہو کر نیچے چادر پر آگیا تھا۔ اُسے احساس ہوا کہ جیسے چادر بھیگی ہوئی ہو۔۔۔

"یہی تو کمائی کا وقت ہے۔ اتنے میں چار خوش ہو گئے ہوتے!" جگنو نے کہا اور دونوں بانہوں میں کس کر اُسے بھینچ لیا تھا۔

اور جب وہ اٹھ کر بیٹھا تو جگنو نے مذاق مذاق میں اُس کا تھیلا کھول لیا تھا، "بہت روپیہ بھر کر چلتے ہو۔" وہ سمجھا شاید مذاق کے بہانے وہ ایک آدھ روپیہ اور ہتھیانا چاہتی ہے۔ تھیلے میں کاغذ، اخبار اور روئی دیکھ کر وہ خفیف ہو گئی تھی۔

"پھر بھی کبھی آنا تو پوچھ لینا۔ سیدھے آؤ گے نا؟" جگنو نے کوٹھری سے باہر نکلتے

نکلتے کہا تھا۔ تب اس نے جگنو کو پہلی بار غور سے دیکھا تھا اور چپ چاپ چلا گیا تھا۔

جب بھی جگنو بازار سے گزرتی تو سر پر پلو ڈال کر۔ وہ اتنی چھچھوری بھی نہیں تھی کہ اُس پر کوئی آوازیں کستا۔ سب اُسے ایسے دیکھتے گویا اُس پر اُن کا پورا پورا حق ہو۔ وہ راہ چلتے کنکھیوں سے اُن لوگوں کو ضرور دیکھ لیتی تھی جنھیں وہ بخوبی پہچانتی تھی اور جو اُس کے مردوں کی طرح اُس کے پاس آتے جاتے تھے۔ تبھی وہ ایک دن دکھائی دیا تھا۔ وہی تھیلے والا آدمی۔ ایک عمارت کی پہلی منزل کی گیلری پر کہنیاں ٹیکے وہ بیڑی پی رہا تھا۔ وہی قمیض پہنے ہوئے تھا۔ عمارت پر لال جھنڈا لگا ہوا تھا جس کا سایہ اُس کے کندھوں پر لرز رہا تھا۔

ٹوٹی ہوئی چپل کی مرمت کے لیے وہ وہیں رک گئی تھی۔ وہ شاید اندر چلا گیا تھا۔

رات کو وہ آیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اب شناسائی تھی۔ اس بار وہ گھبرا نہیں رہا تھا۔ کھاٹ پر بیٹھے بیٹھے جگنو نے پوچھا تھا، "تم کیا کام کرتے ہو۔"

"کچھ نہیں،" اس نے کہا تھا۔ "مزدوروں میں کام کرتا ہوں۔"

"ہمارا بھی کام کر دیا کرو ۔۔۔ ہم بھی مزدور ہیں۔"

"تمھیں دیر نہیں ہو رہی ہے،" اُس نے کہا تھا۔

"آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے،" جگنو السانتے ہوئے بولی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"کمر بہت دکھ رہی ہے۔ سارا بدن پھوڑا ہوا جا رہا ہے،" جگنو نے کہا۔ "پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے ۔۔۔ تارا کو بلا دوں ۔۔۔ بہت شرافت سے پیش آئے گی ۔۔۔ سمجھ دار عورت ہے۔"

اُس نے منع کر دیا تھا۔ کچھ دیر بیٹھ کر جب وہ رخصت ہونے لگا تھا تو صرف اتنا ہی بولا تھا، "میں ایسے ہی چلا آیا تھا۔" اور پھر چپ چاپ اندھیری سیڑھیوں میں اتر گیا تھا۔

جگنو خاموشی سے آ کر کھڑکی پر کھڑی ہو گئی تھی۔ اُس نے سوچا شاید وہ کسی اور زینے پر چڑھ جائے گا۔ گلی میں زیادہ آمد و رفت نہ تھی۔ تھوڑی تھوڑی دور پر آدمیوں کی تین چار ٹولیاں کھڑی تھیں۔ اُن میں سے علیحدہ ہو کر کبھی کوئی کسی مکان میں گھس پڑتا تھا۔ نانبائی کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا ۔۔۔ وہ اُسے دیکھتی رہی تھی۔ وہ کہیں رکا نہیں۔ دھیرے دھیرے گلی پار کر کے سڑک کی جانب مڑ گیا تھا۔ اُسی سڑک پر جہاں وہ عمارت واقع تھی،

جس میں وہ رہتا تھا۔ جگنو کو اس کا یوں لوٹ جانا بہت اچھا لگا تھا۔ ہلکی سی مسرت ہوئی تھی اُسے۔ کوٹھری میں پلنگ پر آکر وہ لیٹ رہی تھی۔

کوٹھری میں بہت سیلن تھی اور گھٹی گھٹی سی بدبو۔ دروازہ اُس نے بند کر لیا تھا اور فلمی گانوں کی کتاب اٹھا کر دل ہی دل میں پڑھتی رہی تھی۔

تبھی دروازہ پر دستک ہوئی اور ماں کی آواز سنائی دی تھی، "جگنو بیٹی! موا بے ہوش تو نہیں ہو گیا!"

"یہاں کوئی نہیں ہے اماں۔۔۔"

"تو برآمدے میں نکل آ بیٹے۔۔۔ بڑی اچھی ہوا چل رہی ہے۔۔۔ گلی میں رونق بھی ہے،" کہتے ہوئے اماں نے دروازہ کھول دیا تھا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"کچھ گڑبڑ ہے اماں!"

"تو ایک گلاس دودھ پی لو بیٹا۔۔۔ ابھی تو وقت ہے، کوئی آ گیا تو۔۔۔" اور وہ اٹھ آئی تھی۔ اس کی گردن ہتھیلی پر رکھتے ہوئے اماں نے بخار دیکھا اور کمر کے اوپر پیٹھ کے گوشت کی لوٹتی ہوئی سلوٹیں دیکھ کر بولی تھی، "صحت کا خیال چھوڑ دیا ہے تو نے۔ کمر پر کتنی موٹی پرتیں گرنے لگی ہیں۔ تھوڑی سی ورزش کر لیا کر۔" کہتے ہوئے وہ دوسری کوٹھری میں چلی گئی تھی۔ دوسری کوٹھری سے کچھ تیز تیز آوازیں آ رہی تھیں۔ اور اماں بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی تھی۔ "یہ چڑیل بنا لڑے لگام نہیں ڈالنے دیتی۔۔۔ کسی دن اس کوٹھری میں قتل ہو گا۔"

یہ روز کا معمول تھا۔۔۔ بلقیس کو اماں یونہی کوستی تھی۔ خود بلقیس کا کہنا تھا کہ اُس کے پاس سے کوئی بنا کمر پکڑے واپس نہیں جا سکتا۔ بلقیس کو اُس میں لطف بھی ملتا تھا۔ گاہک کو رخصت کرتے ہی وہ دروازے پر آ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ اور اُسے شکست خوردہ جاتے دیکھ کر تالیاں بجا کر بڑی اونچی آواز میں ہنستی تھی، "اری او مردار زبیدہ! ذرا دیکھ۔۔۔ رستم جا رہا ہے! بڑا آیا تھا پہلوان کا بچہ! یہ مرد سوئے گا عورت کے ساتھ!"

ایک روز ایک گاہک بگڑا تھا، "کیا بک رہی ہے۔"

"ارے جا جا چمار کی اولاد، لے یہ چونی لے جا، چھٹانک بھر ملائی کھا لینا۔"

اور وہ آدمی پٹا ہوا سا سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ پورے کوٹھے میں بلقیس کے وجود سے

دہشت چھائی رہتی تھی۔ پتہ نہیں کب جھگڑا ہو جائے!

جگنو کو دیکھ کر بلقیس ہمیشہ طعنے دیتی تھی، "تو تو کسی کے گھر بیٹھ جا۔۔۔" لیکن جگنو کسی سے لڑتی نہیں تھی وہ جانتی تھی کہ بلقیس بڑی منہ پھٹ ہے۔ اماں تک کا لحاظ نہیں کرتی اور اماں، تھی کہ سب کے تن بدن کا خیال رکھتی تھی۔ بدن سڈول و مجل رکھنے کے لیے وہ ہمیشہ چیختی رہتی تھی، "بھینس کی طرح پھیلتی جا رہی ہے۔ سانٹن کا پیٹی کوٹ پہنا کر آلو کھانا بند کر کلموہی۔"

پیٹ پر ڈھلان آتے ہی وہ زبیدہ کے لیے اندر صندوق میں سے پیٹی نکال لائی تھی، "دن میں اسے باندھا کر! چائے پینا کم کر۔" اور اُس نے زین کی ہر ناپ کی انگیا لا کر رکھ دی تھی۔ "میرا بس چلے تو عمر روک دوں تم لوگوں کے لیے۔"

دوپہر میں اماں بڑے پیار سے کبھی کسی کے بال سنوارنے بیٹھ جاتی۔ کبھی شام کے لیے ساریوں پر استری کرتی اور بسنت کے دن تو وہ سب کے لیے بسنتی جوڑا رنگتی تھی۔ فتے کے لیے رومال رنگنا بھی نہ بھولتی۔ عید، بقر عید، ہولی، دیوالی بڑے حوصلے سے مناتی اور کبھی کبھی کملائی یاد کر کے نمناک آنکھوں سے کہتی، "اُس جیسی لڑکی تو ہزار کوکھیں بھی نہیں جن پائیں گی۔۔۔ خدا نے کیا حسن بخشا تھا۔ ہاتھ لگاتے ہی میلی ہوتی تھی۔۔۔ اُسے تو پیسے والوں کی نظر کھا گئی۔ زہر دے دیا کتوں نے۔۔۔ بہت چھپائی تھی بچاری۔ ہائے میں تو اسپتال بھی نہ لے جا پائی۔"

جگنو برآمدے میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ بھیڑ دھیرے دھیرے ہلکی ہو رہی تھی۔ پھول گجرے والے اٹھ کر جا رہے تھے۔ اور اُس نے دیکھا تھا۔۔۔ حسب معمول آج بھی منن مالی نے گزرتے ہوئے ایک گجرا کلاوتی کی کھڑکی میں پھینکا تھا اور کلاوتی نے روز کی طرح مسکرا کر گالیاں دی تھیں۔ بنے قلعی والا دھلی ہوئی تہمد اور جالی دار بنیائن پہنے آیا تھا اور سیدھے شہناز کے کوٹھے پر چڑھ گیا تھا۔

شنکر پٹواری کے سامنے چبوترے پر نیم پاگل چنی لال نے اپنا بوریا بچھا لیا تھا اور تام چینی کے جگ میں چائے پیتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا، "ارے ظالم اسی دن ہاتھ قلم کروا لے جس دن غلط سر نکل جائے! یہیں اتر کر آئے گی۔۔۔ اسی بوریے پر سہاگ رات ہوگی۔۔۔ ارے ظالم!" اور تبھی ایک لمحہ کے لیے گلی کے موڑ پر جگنو کو اس نیلی قمیض والے کا شک ہوا تھا۔

شاید وہ پھر لوٹ کر آیا ہے اور چپکے سے کہیں چڑھ جائے گا لیکن اُسے دھوکہ ہوا تھا۔ وہ نہیں تھا۔ کوئی اور آدمی تھا۔

پھر بہت دنوں بعد وہ آیا تھا۔ اور جگنو کی کوٹھری میں آتے ہی گھر کی طرح کھاٹ پر دراز ہو گیا تھا۔ لیکن جوتے اتارنے کی پھر بھی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"تم اپنا نام تو بتا دو؟" جگنو نے بغل میں لیٹتے ہوئے پوچھا تھا۔

"مدن لال۔۔۔ کیوں۔"

"ایسے ہی۔۔۔ یہاں نہیں تھے کیا؟"

"جیل میں تھا۔۔۔ گرفتاریاں ہو رہی تھیں، اسی میں چلا گیا تھا۔۔۔"

"کیوں؟"

"ہڑتال چل رہی تھی۔۔۔ مالکوں نے بند کروا دیا تھا۔ بڑی مشکل سے رہا ہوا۔"

"اس ہڑتال وڑتال سے کچھ ہوتا بھی ہے؟ کاہے کوئی تھی؟"

'بغیر نوٹس برخاستگی ہوئی تھی۔ تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گا اور بھی بہت سارے مسئلے تھے۔"

"جوتے اتار لوں،" مدن لال ہچکچاتے ہوئے کہا تھا۔

"اتار لو۔" اور کریچ کے جوتوں اور پسینے میں بھیگے ہوئے پیروں سے جو بھبک اٹھی تھی، اُس سے جگنو پر کوئی خاص رد عمل نہیں ہوا تھا۔۔۔ دھیرے دھیرے وہی بو جیسے اُس کے چاروں طرف پھیل گئی تھی۔۔۔ اور پھر اُس کے بدن میں بھر گئی تھی۔

مدن لال تو چلا گیا تھا، لیکن اُس کی وہ مخصوص بو رہ گئی تھی، اور اُنھی دنوں تمام طوائفوں کو ڈاکٹری معائنے کے لیے حاضر ہونا پڑا تھا اور ڈاکٹر نے اتنا ہی کہا تھا کہ اُسے کوئی پوشیدہ مرض نہیں، لیکن تپ دق کے آثار ضرور ہیں۔

دیکھتے دیکھتے کھانسی نے شدت اختیار کر لی تھی۔ بخار رہنے لگا۔ اماں ہسپتال لے جا کر دکھا آئی تھی لیکن مرض تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ اپنے کام کے لائق بھی نہیں رہی۔ ایک دن خون تھوکا تو بلقیس نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ارے اسے ڈلواؤ کہیں باہر ہمیں مرنا ہے کیا؟ تو اماں نے اسے زور سے ڈانٹا تھا۔ لیکن اندر سے وہ بھی دہل گئی تھی، طرح طرح سے اُس نے جگنو کو سمجھایا کہ وہ اپنی صحت کی خاطر کہیں اور چلی جائے۔

ضرورت کے لیے سو پچاس روپے لیتی جائے۔ لیکن اس طرح لاپرواہی نہ کرے۔

لیکن جگنو حیران تھی کہ وہ کہاں چلی جائے۔ پیسہ بھی پاس نہیں اور سو دو سو کتنے دن کی کفالت کر سکتے ہیں۔ آخر ہار کر وہ سینی ٹوریم میں داخل ہو گئی تھی۔ دھیرے دھیرے اماں کی دی ہوئی اور جمع شدہ رقم بالکل ختم ہو گئی تھی۔ چار ماہ مسلسل اسی سینی ٹوریم میں رہنا پڑا تھا۔ اس کے بعد بھی اسے رخصت نہیں ملی تھی، ہاں کہیں تھوڑی بہت دیر کے لیے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہاں سے نکل کر وہ دو چار بار اماں کے پاس آئی تھی تو اماں نے کہا تھا، "کسی کو بتانا مت بیٹے کہ کہاں تھی۔۔۔ میں نے تو سب لوگوں سے کہا ہے کہ رامپور چلی گئی ہے، اپنی بہن کے پاس، کچھ دنوں کے بعد واپس آ جائے گی۔۔۔ پر مواداروغہ بہت پریشان کرتا تھا۔۔۔ اُسے شک تھا کہ یہیں کہیں بیٹھنے لگی ہے۔۔۔"

اماں کی آنکھوں میں اپنائیت اور خلوص پا کر اسے بڑا سہارا ملا تھا۔ اور اماں اُس کی حالت دیکھ کر دکھی ہو رہی تھی۔ حقیقتاً جگنو کا بدن جھلس سا گیا تھا۔۔۔ بال بہت چھینے ہو گئے تھے اور چہرے کی سرخی یکسر غائب ہو گئی تھی۔

جگنو جب شیشے میں اپنی شکل دیکھتی تو گھبرا اٹھتی تھی۔ اب کیا ہو گا! کیسے بیتے گی یہ پہاڑ سی بیمار زندگی! سہارا۔۔۔ بھی تو نہیں، کوئی ہنر بھی نہیں۔۔۔

پیشے پر پابندی لگ جانے کے باوجود کئی نئی لڑکیاں لکھنؤ، بنارس سے آ گئی تھیں اور انھوں نے بازار بگاڑ رکھا تھا۔ سنا تھا شہناز کی حالت بھی خراب ہو گئی تھی۔ اور کاوتی کے تو بھوکوں مرنے کے دن آ گئے تھے۔

یہ سب جان کر جگنو کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

چلنے سے قبل اُس نے اماں سے کچھ مانگے تھے تو وہ اپنا رونا رونے لگی تھی اور اپنی زبوں حالی کا شکوہ کرنے لگی تھی، اُس کی حالت بھی خستہ تھی۔

اور وہاں سے سینی ٹوریم واپس ہوتے وقت اُس نے اُن سب کی جانب نا امید نگاہوں سے دیکھا تھا، جن سے اُس کی آشنائی تھی، جو اُس کے نہ شباب دور میں آتے جاتے رہے تھے۔

منو کرانی کو دکان پر بیٹھا کر اُس کا دل نفرت سے بھر اٹھا تھا۔۔۔ اُس کا کمر پکڑ کر بیٹھ جانا اور رانیں کھجلاتے ہوئے پیچھے پیچھے کوٹھری سے باہر جانا۔۔۔

کنور جیت ہوٹل والا میلا پاجامہ پہنے نوٹ گن رہا تھا۔ اٹھنے سے پہلے بیٹھے اوں اوں کی ڈکاریں لیتا تھا تو جگنو کا جی متلانے لگتا تھا۔

جگنو نے اوروں کو بھی دیکھا تھا۔۔۔ جن سے تھوڑی بہت میل ملاقات رہی تھی۔

سینی ٹوریم میں اور زیادہ دن رکنا نہیں ہوا۔ آخر آنا تو تھا ہی، لیکن وہ سبھوں کی شکر گزار تھی کہ انھوں نے مصیبتوں کے دنوں میں آنکھیں نہیں پھیری تھیں۔

اور اُس نے جو کچھ جس سے لیا تھا اُسے نسخے کی پشت پر ہی لکھ لیا تھا۔ اتنے دنوں میں خاصا قرضہ چڑھ گیا تھا۔ کنور جیت ہوٹل والے نے بڑا احسان جتا کر سینتالیس روپے دیے تھے۔ منو نے اتنا احسان تو نہیں جتایا تھا لیکن روپے جلد از جلد لوٹا دینے کی تاکید کر دی تھی۔ پچیس روپے سے جیسے اس کا کاروبار رکا جا رہا تھا۔ سنت رام فنر نے تیس روپے دیے تھے اور چلتے چلتے بڑا گندہ مذاق کیا تھا، "سود میں ایک رات۔۔۔ ٹھیک ہے نا۔۔۔ لیکن اس مذاق سے اسے اتنا اندازہ ہوا تھا کہ مرد کی آنکھ اب بھی اُس پر ٹکتی ہے۔ بدن اتنا گیا گزرا نہیں ہوا ہے جتنا کہ وہ شاید سمجھ رہی ہے۔

بدحالی کے ان دنوں میں اُس نے ایک روز مدن لال سے بھی مل کر تیس روپے لیے تھے۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا، "یہ چندے کی رقم ہے جلد دے دو گی تو ٹھیک ہوگا۔ میرے پاس بھی اتنا نہیں ہوتا کہ خود بھر سکوں!" لیکن اس کے لہجے میں بڑی بے چارگی تھی حد درجہ مجبوری ظاہر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا، "جگنو اسے غلط نہ سمجھے۔۔۔ اُس کی اتنی اوقات نہیں ہے۔" اور پھر مزید کچھ کہے بغیر وہ پارٹی کے دفتر میں چلا گیا تھا۔

اور اب جب سے وہ سینی ٹوریم سے لوٹی تھی۔ پولیس والے الگ پریشان کر رہے تھے۔ سات ماہ کا پیسہ انھیں نہیں ملا تھا۔ اُس کے کوٹھے پر انھوں نے سب سے الگ الگ رقم باندھ رکھی تھی۔

لوٹ کر آنے کے بعد سے وہ اندر اندر بڑی نقاہت سی محسوس کرتی تھی۔ بدن اب اتنا سہہ نہیں پاتا تھا۔ کوئی زیادہ چھیڑ تا چھاڑ تا تو ہلکی کھانسی شروع ہو جاتی تھی۔۔۔ اور پانچ پانچ۔۔۔ سات سات منٹ کے اندر ہی دم پھولنے لگتا تھا۔۔۔ اور لوگ تھے کہ سینے پر ہی سارا وزن رکھ دیتے تھے۔

بالوں کی ایک پرانی چوٹی وہ سات روپے میں کلاوتی سے خرید لائی تھی اور چھاتیوں

پر بھی "کپس" لگانے لگی تھی۔ ہر بار انھیں نکالنے اور لگانے میں بڑی الجھن بھی ہوتی تھی۔ کلف لگی دھوتیاں پہننے سے اُسے ہمیشہ چڑھ رہی تھی، لیکن کلف لگی پہنتی تھی۔ بدن ذرا گداز لگتا تھا۔ اتنا سب کرنے کے باوجود آمدنی تسلی بخش نہیں تھی۔ کوئی کوئی رات تو خالی ہی چلی جاتی تھی اور اپنی کوٹھری میں تنہا لیٹے لیٹے اُس پر بڑی گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی۔ یہ طویل طویل زندگی۔۔۔ دن بہ دن ٹوٹتا ہوا جسم۔

سرد قسم کے لوگوں سے اُسے بے حد پریشان ہونا پڑتا تھا۔ وہ حد سے زیادہ پریشان کرتے تھے۔۔۔ بوٹی بوٹی ٹٹولتے رہتے تھے اور جوش آنے کے انتظار میں بہت ستاتے تھے۔ اچانک یہاں وہاں ہاتھ ڈال دیتے تھے اور طرح طرح کی گندی فرمائشیں کرتے تھے۔

ان سے بہتر تو وہ تھے، جو بھری بندوق کی مثال آتے تھے۔۔۔ اور اپنا کام کر کے چلتے بنتے تھے۔ نہ زیادہ بکواس کرتے تھے نہ زیادہ ستاتے تھے۔ لیکن پھر بھی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ گزر بسر ہو سکے۔ قرض اترنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

نسخے کی پُشت پر سبھوں کے روپے لکھے تھے۔۔۔ لیکن اتنی رقم ہاتھ ہی نہ آتی تھی کہ انھیں ادا کر سکے۔

آخر اور کوئی ذریعہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ رانوں کے جوڑوں پر نکلا پھوڑا دکھانے کے لیے جب جگنو جراح کے پاس جا رہی تھی تو راستے میں منسو نے ٹوک دیا تھا، "بہت دن ہو گئے ہیں۔ اب تو دھندا بھی چل رہا ہے۔"

چلتے چلتے وہ ایک طرف کو آ گئے تھے، تب بڑی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے اس نے منسو سے کہا تھا، "ایک پیسہ نہیں بچتا۔ کیا کروں۔۔۔ تم نے تو آنا جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"ہم نے تو گنگا جلی اٹھا لی ہے۔۔۔ رنڈی بازی نہیں کریں گے۔ تلسی کی کنٹھی پہن لی ہے، یہ دیکھو،" منسو بولا تو جگنو کو ہلکی سی ہنسی آ گئی اور وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہ گیا تھا۔

رانوں کے جوڑ پر نکلے ہوئے پھوڑے کی وجہ سے چلنے میں جگنو کو کافی تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ ٹانگیں پھیلا پھیلا کر چل رہی تھی۔۔۔ منسو کا من ڈول رہا تھا۔ گلی کے موڑ پر آ کر منسو نے دھیرے سے کہا تھا، "تو پھر بتایا نہیں تم نے۔۔۔ کب تک انتظام کرو گی۔"

"طاقت ہو تو وصول کر لے جاؤ!" جگنو نے اپنی بے بسی کو پیتے ہوئے بظاہر اشوخی

سے کہا تھا اور گلی میں مڑ گئی تھی۔ اپنی ہی بات پر اُسے بڑی شرم آئی تھی۔۔۔ پھر احساس ہوا کہ ٹھیک ہی تو کہا اُس نے۔۔۔ خواہ مخواہ کی عزت کا کیا مطلب؟ اور پھر کسی کا قرضہ لے کر کیوں مریں؟ جو اتر جائے سو بہتر ہے۔

جراح نے بتایا تھا کہ ابھی پھوڑا پکنے میں کچھ روز لگیں گے۔ باندھنے کے لیے پولٹس دے دی تھی جب وہ لوٹی تو دوپہر ہو چکی تھی۔ سب اپنے اپنے چبوتروں پر بیٹھی ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ یہ وقت ہوتا ہے، جب سب جاگ کر اٹھ جاتی ہیں شام کی تیاری سے قبل مل بیٹھ لیتی ہیں، گلی سے کم سن لڑکوں کی ٹولی گزر رہی تھی، وہ فحش اشارے کر کر کے عورتوں کو چڑا رہے تھے اور باپوں کو دی جانے والی گالیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ آوارہ لڑکے روز گزرتے تھے۔۔۔ اور ان کا روز کا یہی مشغلہ تھا، ڈھلتی عمر کی عورتیں گندے اشارے دیکھ کر اُن کے باپوں کو نت نئی گالیوں سے نوازا کرتیں۔ اور نوجوان عورتیں مسکراتی رہتیں کبھی کبھی بنواری یا لنگڑا ماتادین اُن لڑکوں کو ذرا بھی دیتے تھے تب وہ گلی کے نکڑ پہ پہنچ کر گالیاں دیتے تھے اور نیکریا گھٹنا اٹھا اٹھا کر بے ہودہ حرکتیں کرتے تھے۔ لڑکوں کی یہ ٹولی مسجد کے پیچھے والی گلی سے آیا کرتی تھی۔

دوپہر ہی میں دنیا جہاں کی باتیں ہوا کرتی تھیں، اپنے دکھ سکھ، اس کی برائی اُس کی اچھائی۔ ان سب باتوں کا مرکز زیادہ تر اُن کی ذات ہوا کرتی تھی جو اس محلے کو خیر باد کہہ کر شریفوں کی بستیوں میں بس گئی تھیں۔۔۔ جنھیں چھانٹ چھانٹ کر ابراہیم لے گیا تھا۔

شام ہوتے ہی گلی گرمانے لگتی تھی۔ پھول ہار والے آجاتے تھے۔ پنواڑیوں کی دکانیں سج جاتیں اور غفور کی دکان پر ایک حوالدار آکر بیٹھ جاتا تھا۔۔۔ اُس کے بیٹھتے ہی غفور کھلے عام بوتلیں فروخت کرنا شروع کر دیتا تھا۔

جلّو شام کو پولٹس ہٹا دیتی تھی اور بڑی بے دلی سے بناؤ سنگھار کر کے بیٹھ جاتی تھی۔ پھوڑا اگا نُہ بن کر رہ گیا تھا، درد بہت کرتا تھا۔ پھر بھی وہ جیسے تیسے ایک آدھ کو نپٹا دیتی تھی۔

برآمدے میں بیٹھے بیٹھے جب وہ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچتی تھی تو بے شمار اندیشے اُسے گھیر لیتے، تب وہ بے انتہا پریشان ہو جاتی۔ آخر کیا ہو گیا؟ وہ تو دانے دانے کو محتاج ہو جائے گی۔ لنگڑی گھوڑی کی زندگی آخر وہ کیسے جی پائے گی؟۔۔۔ کیا اُسے بھی مسجد کی سیڑھیوں پر برقعہ پہن کر بیٹھنا ہوگا اور سبھوں کے سامنے دست سوال دراز کرنا

ہوگا؟ اختری کی طرح ۔۔۔ ہنو اور چمپا کی طرح ۔۔۔ یہ سب سوچ سوچ کر جب اُس کا دل بہت گھبرانے لگتا تو وہ زہر کھانے کی بات سوچتی یا ڈوب مرنے کی۔

سینکڑوں مرد آئے اور گئے ۔۔۔ لیکن کوئی ایسا مرد نہیں جس کی پرچھائیں تلے عمر کٹ جائے۔

ذرا زیادہ جان پہچان انھی سے تھی جن سے روپے لیے تھے۔ مگر آسرا وہاں بھی نہ تھا۔ کسی کا کیا بھروسہ ۔۔۔ کون کہاں چلا جائے! عمر کے ساتھ سب لوٹ جاتے ہیں۔ جہاں بال بچے بڑے ہوئے کہ ان کا آنا جانا بند۔ جہاں عمر ڈھلی کہ آدمی نے دوسرا شوق دوسرا مشغلہ ڈھونڈا ۔۔۔ تب کون آئے گا؟ پرانی شناسا شکلیں بھی نہیں دکھائی دیں گی۔ تب کتنا عجیب اور تنہا تنہا سا سب کچھ محسوس ہوگا ۔۔۔ بیتے ہوئے لمحات میں بیٹھ کر جینا کتنا اذیت ناک ہوگا ۔۔۔!

گزشتہ دنوں میں اُس کے لیے بس یہی ایک بات تسکین کا باعث بنی کہ سبھی قرضے دار اپنی اپنی رقم وصولنے اُس کے پاس آتے رہے ہیں ۔۔۔ اُسے امید تھی منسو ضرور آئے گا، وہ اپنا پیسہ ضرور وصول کرے گا ۔۔۔ اور وہ آیا تھا۔

منسو کے جسم سے ویسا ہی بھبکا اٹھا تھا۔ اور وہ آیا بھی گیارہ کے بعد ہی تھا اور لیٹ چکنے کے بعد کمر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ جگنو بھی بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ پھوڑے پر دباؤ پڑنے کی وجہ سے وہ بلبلا اٹھی تھی اور اُس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ منسو کو اٹھا کر دروازے تک پہنچا آئے تاکہ وہ حسب معمول رانیں کھجلاتا ہوا چلا جائے۔

منسو کی اکڑی کمر جب ڈھیلی پڑی تو اُس نے کہا تھا، "یاد رکھنا،" جگنو نے "اچھا" کہا تھا اور منسو کو سہارا دے کر اٹھا دیا تھا۔ رات زیادہ ہوگئی تھی اور اُسی جگہ جگہ پڑی پڑی کوٹھری کی دیواروں کو دیکھتی رہی تھی لیکن اُن میں دیکھنے لائق کوئی چیز نہ تھی۔ مٹ میلی بھدی دیواریں، جن پر کبھی اُس نے ردی رسالوں سے کاٹ کاٹ کر فلمی ستاروں کی تصویریں چپکائی تھیں۔ کونے کی کیل پر ایک ڈوری، جس پر پرانی چوڑیوں کا ایک گچھا لٹک رہا تھا۔ کھاٹ کے نیچے گدڑی تھی اور ٹین کا بکس۔ بکس میں بارہ برس قبل کا ایک خط پڑا ہوا ہے جس کے حروف بھی اڑ چلے ہیں ۔۔۔ اب اس خط کا کوئی مطلب نہیں رہ گیا ہے۔ مکتوب اپنی زندگی کھو چکا ہے۔ اور اب کون جاتا ہے واپس ۔۔۔ اور کون بلاتا ہے واپس ۔۔۔ زندگیوں کے

درمیان وقت کا دریا کہ تھا نکل رہا ہے۔۔۔ کہیں کوئی نہیں ہے۔۔۔ کوئی کہیں نہیں ہے۔

صبح اٹھی تو بدن ٹوٹ رہا تھا پھوڑے میں بے حد تکلیف تھی۔ ران کا جوڑ پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے پھر پولٹس باندھ لیے تھے اور شام جیسے تیسے تیار ہو گئی تھی۔ کوٹھری میں جا کر سب کا حساب جوڑنے لگی۔ الماری کی دیوار پر اُس نے نشان لگا رکھے تھے کہ کون کتنی بار آیا تھا اور کتنے روپے بے باق ہو چکے تھے۔ سنت رام واقعی بڑی بدتمیزی سے پیش آیا تھا۔ جس روپے کے عوض وہ چار بار آ چکا تھا اور پانچویں بار جب جانے لگا تو جگنو نے بڑی آہستگی سے کہا تھا، "یونہی جا رہے ہو۔"

"کیوں؟" سنت رام کی نگاہوں میں کمینگی تھی۔

"تمھارے روپے تو پچھلی بار ہی پٹ گئے تھے،" اس نے بہت جھجکتے ہوئے لیکن صاف لہجے میں کہا تھا۔

"ایک بار کی سو دو کی!" سنت رام نے بڑے گندے لہجے میں کہا تھا، "چھوکٹ کا پیسہ نہیں آتا کبھی،" اور کوٹھری سے نکل کر تیز تیز سیڑھیاں اتر گیا تھا۔

جگنو بھونچکی سی دیکھتی رہ گئی تھی، اوروں کی طرح وہ جھگڑا بھی نہیں کر پاتی تھی۔ چیخ چلا بھی نہیں سکتی تھی اور گاہک کو ذلیل کرنا بھی اسے پسند نہیں تھا۔

کنور جیت ہوٹل والے کے سب سے زیادہ روپے چڑھے ہوئے تھے وہ صرف تین بار آیا تھا اور کل پندرہ روپے تھے۔ ہلکی راحت کا احساس ہوا تھا کہ تبھی پھوڑے میں شدت کی ٹیس اٹھی۔ وہ ٹانگیں پھیلا کر وہیں بستر پر لیٹ گئی تھی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی تو دیکھا کہ مدن لال تھا۔ اُسے دیکھتے ہی ایک لمحہ کے لیے اندر ہی اندر جلا اٹھی تھی گویا ایک اور سود خور سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہو۔۔۔ اپنی وصولیابی کے لیے۔

مدن لال اُس دوران نہیں آیا تھا۔ اُس کا اس وقت آنا جگنو کو گراں گزرا تھا۔ پھر بھی بے چارگی کے عالم میں اُس نے اندر بلا لیا تھا۔۔۔ مدن لال کھاٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اپنا تھیلا اُس نے سرہانے سرکا دیا تھا۔ جگنو خاموشی سے تھیلے کو ٹٹولنے لگی تھی۔ اُس میں کچھ پوسٹر تھے اور تہہ شدہ ایک جھنڈا اور چند پرانے سے جھنڈے بھی تھے۔ اس کا دل دھڑک اٹھا تھا کہ کہیں وہ اپنے پیسوں کا مطالبہ نہ کر بیٹھے۔ پھوڑا الگ اذیت دے رہا تھا۔

مدن لال وہی پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور وہی جوتے۔ پسینے کی بو پوری کوٹھری میں بھر گئی تھی۔

"بہت دنوں بعد آنا ہوا،" بڑی ہمت کر کے جگنو نے پوچھا تھا۔

"جوتے اتارلوں،" مدن لال نے آہستگی سے کہا۔

"اتارلو۔"

"دروازہ بند کر دوں۔"

"آج بے حد تکلیف ہے۔۔۔ ران کے جوڑ پر پھوڑا نکلا ہوا ہے۔ سیدھی تو لیٹ بھی جاؤں لیکن ٹانگیں موڑتے ہی جان نکل جاتی ہے،" جگنو نے کہا تو مدن لال تسمے کھولتے کھولتے ٹھٹک گیا تھا، دل میں شرما سا گیا تھا۔ جگنو بھی کچھ عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ لیکن مدن لال نے جلد ہی گفتگو شروع کر کے اُسے اس کیفیت سے نجات دلادی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا تھا، لیکن ہر لحہ جگنو کو ڈر لگا رہتا کہ کہیں بات گھوم پھر کر روپیوں پر نہ آجائے۔

"اچھا تو چلتا ہوں۔۔۔" مدن لال تھیلا لے کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس نے بہت بھری بھری نظروں سے جگنو کو دیکھا تھا۔۔۔ جیسے آج لوٹنے سے اُسے دکھ ہو رہا تھا۔

اور ساری باتوں کے باوجود جگنو اب دوبارہ اُس سے رکنے کو کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ بہت ہچکچاتے ہوئے اُس نے کہا تھا، "وہ تمھارے روپے۔۔۔"

"اُن کے لیے نہیں،" مدن لال نے کہا، "تمھارے لیے آیا تھا۔"

اُس کی بغلوں کے نیچے بھرا ہوا پسینہ سیاہی کے دھبوں کی مانند چمک رہا تھا، بازوؤں کی ابھری ہوئی رگیں پسیجی ہوئی تھیں۔ اُس نے پسیجے ہاتھوں سے جگنو کا ہاتھ پکڑا تھا جیسے ہتھیلی میں ملائم و خستہ روٹی کی ہلکی سی تپش سما گئی ہو۔

"میں پھر آؤں گا۔۔۔" کہہ کر مدن چلا گیا تھا۔ جگنو سیدھے برآمدے میں آگئی تھی۔ دل میں کہیں افسوس بھی تھا کہ اُسے ایسے ہی لوٹ جانا پڑا۔ مدن لال کو وہ دیکھتی رہی۔۔۔ وہ گلی میں تین چار گھر پار کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس کا گلی میں رکنا جیسے اُس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ پھر وہ اوپر برآمدے پر ایک نظر ڈال کر پانچویں کوٹھی کی سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔ پتہ نہیں کیسی تلملاہٹ ہوئی تھی۔ پھوڑے میں زور کی ٹیس ہوئی تھی۔ پھر

دھیرے دھیرے جلن تھمنے لگی تھی۔ اگر اس نے روکا ہوتا تو شاید نہ جاتا۔۔۔ آخر رات بھی تو ۔۔۔ جلن برداشت ہونے لگی تھی۔ وہ تو صرف اُس کی تکلیف کا خیال کر کے لوٹ گیا تھا۔ اب اُس کے پیچھے ہاتھ کی گرماہٹ میں کسی قسم کا فریب نہ تھا۔

تبھی کنور جیت آ گیا تھا۔ اچانک اُسے ایسا لگا جیسے کوئی غیر گھر میں گھس آیا ہو لیکن خود کو سنبھالتے ہوئے اُس نے اُس کی جانب مسکرا کر دیکھا تھا۔

بلقیس اُدھر کونے میں کھڑی کسی پہلوان سے بات کر رہی تھی۔ جگنو چپ چاپ کنور جیت کو لے کر کوٹھری میں چلی گئی تھی۔ دروازے بند کر لیے تھے۔ کنور جیت نے کنڈی چڑھا دی تھی۔

"آج بہت تکلیف ہے۔ پھوڑا ایک گیا ہے،" جگنو نے عاجزی سے سمجھایا تھا۔

"ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا؟" کنور جیت نے پوچھا تھا۔

"ہوں۔ شاید ایک دو دن میں پھوٹ جائے!" جگنو نے گویا معذرت چاہی تھی۔

"بالکل تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔۔۔ بہت آسانی سے۔۔۔" کہتے ہوئے کنور جیت کھاٹ پر لیٹ گیا تھا۔

"آج۔۔۔" جگنو نے کہا، تو اُس نے بڑی نرمی سے اسے بغل میں لٹا لیا تھا۔ اور بولا تھا، "ذرا بھی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔"

جگنو بہت مجبور ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کیسے سمجھائے، تبھی اُس نے اُس کی چھاتیوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ دھیرے سے کروٹ بدل کر جگنو نے لائٹ بجھا دی تھی اور بالاؤز میں ہاتھ ڈال کر کپس نکالے اور کھاٹ کے نیچے سرکا دیے تھے۔

کئی بار اُس نے کراہ دبائی اور کنور جیت کو روکا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا اور دباؤ پڑتے ہی ران پھٹنے لگتی تھی۔ کنور جیت تین چار بار رکا پھر جیسے اُس پر شیطان سوار ہو گیا۔

"ارے رُک تو۔۔۔" وہ چیخا تھا اور جگنو کی ٹانگیں دبا کر حاوی ہو گیا تھا۔

"ارے لٹاں رے۔۔۔ مار ڈالا۔۔۔!" وہ درد سے بے قابو ہو کر پوری آواز میں چیخی تھی جیسے کوئی اُسے قتل کر رہا ہو اور پھر چھٹپٹا کر بے ہوش سی ہو گئی تھی۔

"سالی،" ہانپتے ہوئے کنور جیت نے کہا اور اسے چھوڑ کر نڈھال سا بیٹھ گیا تھا۔

چند لمحے بعد جگنو کو ہوش آیا تھا۔ درد کچھ تھما تھا تو اُس کے ہاتھ پیر ہلے تھے۔ تکیے کے نیچے سے کپڑا نکال کر اُس نے لائٹ جلائی تھی تو پوری جانگھ پھوٹے ہوئے پھوڑے کے مواد سے لت پت تھی اور کنور جیت اُس سے بالکل الگ بیٹھا اوں۔۔اوں کر کے ڈکاریں لے رہا تھا۔

'پھوٹ گیانا۔۔۔' اُس نے جانگھ پر سے ساری کھسکالی تھی۔

"دھیان رکھنا، چوتھی باری ہوئی!" کنور جیت نے کہا اور کنڈی کھول کر کوٹھری سے باہر نکل گیا تھا۔

ساری کھسکا کر وہ مواد پونچھنے لگی تھی۔ یک لخت دل بڑا گھبرا اٹھا تھا۔ اُس نے دھیرے سے فتے کو آواز دی تھی۔ فتے آیا تو اُس نے گھڑے سے پانی نکلوایا اور کپڑا بھگو کر مواد پونچھتے ہوئے بولی تھی، "دیکھ فتے۔۔۔ اُدھر بملا کے گھر ایک آدمی گیا ہے۔ چلا نہ گیا ہو تو ذرا بلالا۔ نیلی قمیض پہنے ہے۔ تھیلا ہے اس کے پاس۔"

"گاہک آدمی ہے؟" فتے نے پوچھا تھا۔

"نہیں آپس کا آدمی ہے!" جگنو نے کہا، "ذرا سا پانی اور دے دے۔"

فتے گھڑے سے پانی نکال کر لایا تو پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی، "رہنے دے۔۔۔ تو اپنا کام کر، وہ کہہ گیا ہے، آجائے گا کبھی۔۔۔" کہتے کہتے اُس نے آہستہ سے پھوڑے کو دبایا تو کچھ اور مواد نکل پڑا۔ اور درد سے پھر چہرے پر پسینہ چھلکنے لگا تھا۔

بیان

اس سے زیادہ میں کیا بتا سکتی ہوں! ایک آدمی عورت کے درمیان جو کچھ ہوتا ہے۔ وہ ہوتا ہے۔ اس کے تعلقات کی بنیاد صرف انھیں میں نہیں ہوتی۔۔۔

جی میں بہک نہیں رہی ہوں۔ سننا ہے تو پوری بات سنیے۔ ٹکڑے ٹکڑے باتوں سے میرا جی بہت گھبراتا ہے۔ اگر آپ صرف میری شادی سے کچھ قبل کی، کچھ درمیان کی اور آخری باتیں ہی جاننا چاہتے ہیں تو میں مشین کی طرح بتاتی جاؤں گی، کیونکہ مجھے بتانی پڑیں گی۔ خاموش رہ کر میں آپ کے قانون سے بچ سکتی ہوں نہ لوگوں کی حقارت سے اور نہ اپنی بچی کے سوالوں سے۔۔۔

سوائے میری زندگی کے کوئی اور جواب میرے پاس نہیں ہے جو کچھ ہے وہ میری زندگی میں ہی بکھرا ہوا ہے۔ وہ لمحے جنھیں میں کبھی بکھرنے نہیں دیتی۔ وہ بھی اب یادوں سے چھلک گئے ہیں یا چھلک رہے ہیں۔ اب مجھے چھپانا کیا ہے کس کے لیے؟ اور کیوں؟

جی۔۔۔ ہاں۔ یہ سچ ہے! شادی سے قبل میں بشن کو چاہتی تھی، لیکن اُس کا اس معاملے سے کیا لینا دینا ہے۔ جھوٹ سچ کے قلابے مت ملائیے میں بھگوان کا واسطہ دے سکتی ہوں۔۔۔ اُس کا کوئی تعلق اس حادثے سے نہیں ہے۔ بھگوان کے لیے مجھے ذلیل مت کیجیے۔۔۔

مجھے نہیں معلوم بشن اب کہاں ہے۔ یہ تو بائیس سال قبل کی بات ہے بلکہ اس سے بھی ایک آدھ برس قبل کی۔ نہیں ہم نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ نہیں نہیں۔ وہ میری

شادی کے وقت موجود نہیں تھا۔ اُس نے کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔ بشن اس طرح کا لڑکا نہیں تھا۔ وہ بہت سمجھدار، سنجیدہ اور ذہین تھا۔۔۔

جی۔ غلط مطلب کیوں لگاتے ہیں؟ ان الفاظ کے استعمال سے آپ کو لگتا ہے کہ میں آج بھی اُس کو چاہتی ہوں! آپ جو چاہیں سمجھیں میں کیا کہہ سکتی ہوں لیکن کیا مجھے یہ حق نہیں کہ میں اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہہ سکوں؟

نہیں، میرا بشن سے بس اتنا ہی پیار تھا جتنا کہ بائیس چوبیس برس قبل کوئی بھی لڑکی کسی بھی لڑکے سے کر سکتی تھی۔ میں کب انکار کر سکتی ہوں کہ وہ مجھ سے نہیں ملا۔ لیکن میرا اعتبار کیجیے۔۔۔ شادی کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں گیا۔۔۔ سچ!

دیکھیے پھر غلط بات کہی جارہی ہے۔ میں آتمائی گہرائیوں سے کہتی ہوں کہ میرے شوہر نے مجھے بے انتہا پیار کیا۔ اُنھوں نے مجھے کبھی تنگ نہیں کیا۔ میں نے؟ اس کی گواہی تو صرف وہی دے سکتے ہیں اگر وہ ہوتے۔

یہ سراسر غلط ہے۔۔۔ آپ لوگ غلط اور بے کار سوالوں سے صحیح نتیجے تک کیسے پہنچیں گے! ان سب فضول کی باتوں سے آپ اُن کی موت کی وجوہات نہیں تلاش کر سکتے۔ شادی سے پہلے کا بادل کے ٹکڑے کی طرح تیر کے گزرا ہوا عشق۔۔۔ اُس پریم کی کالی پرچھائیاں۔۔۔ میاں بیوی کا جھگڑا۔ گھر والوں سے تناؤ یا پڑوسیوں سے خفگی۔ یہ سب بڑی معمولی باتیں ہیں۔ آپ ابھی تک اُنھیں کے سہارے حقیقت تک پہنچنے میں لگے ہیں۔ اس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔

اُن کے ساتھ میری آخری رات! اگر کہیے تو کچھ اس طرح بتادوں کہ آپ کا اندھا اور بہرہ قانون کسی نتیجے تک پہنچ جائے لیکن اُس رات میں ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ہماری وہ رات بھی بہت معمولی تھی۔ ایک ایسی رات جو اوسط آدمی کی رات ہوسکتی ہے۔

میں نے۔۔۔ میں نے کوئی طعنہ نہیں دیا۔ وہ غصّے میں قطعی نہیں تھے ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو سمجھا لیتے تھے۔ گزشتہ کئی برسوں سے ہماری راتیں یونہی گزرتی تھیں۔ ہمارے پاس اور تھا ہی کیا؟ سوائے ایک دوسرے کے۔۔۔ سوائے پریشانیوں کے۔۔۔

بچی! وہ ہمارے پاس ایک چھوٹی سی کھاٹ پر سوتی تھی۔ جی! صرف دو کمرے ہیں۔ ایک کمرہ بیٹھک کا کام دیتا ہے۔ شام کو وہ گھومنے گئے تھے۔ کبھی کبھی وہ شام کو لوٹتے تھے۔ لیکن

اس دن وہ بر وقت لوٹ آئے تھے۔ بچی کے لیے چار ٹافیاں بھی لائے تھے۔ وہ انھوں نے اس کو دے دی تھیں۔ دو دوسرے دن کے لیے کاغذ کے نیچے رکھ دی تھیں۔

جی، اس سے قبل وہ ایک سرکاری جریدہ میں تھے۔

ہاں۔

جی ہاں! فوٹوگرافر ہی تھے۔ اُنھوں نے اپنا دھندہ کبھی نہیں بدلا۔ اُنھیں بھروسہ تھا کہ ایک دن وہ بہت بڑے فوٹوگرافر بنیں گے۔ اُن کی زندگی کا یہی مقصد تھا۔

کبھی نہیں۔۔۔ انھوں نے کبھی ماڈل فوٹوگرافری نہیں کی۔ اگر وہ کرتے تب بھی ہمارے درمیان کوئی بال نہیں آتا۔ اُن کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت عورت، بیوی، لڑکی جو کچھ تھی میں ہی تھی۔

آپ مسکرا لیجیے۔۔۔ آپ کو میں بہت معمولی ہی لگوں گی۔ لیکن مجھے میرے شوہر کی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کیجیے۔۔۔ تبھی آپ میری بات کو سمجھ پائیں گے۔ کیمرہ اور میں۔۔۔ بس۔۔۔ اُن کے لیے یہی دو چیزیں تھیں۔۔۔ یا پھر ہماری بچی کبھی کبھی میں اُن کے سینہ پر سر رکھ لیتی تھی تو اُن کی انگلیاں میرے کانوں کی لوؤں پر اس طرح تھرتھراتی تھیں جیسے کسی اوجھل ہو جانے والے لمحے کو پکڑنے کے لیے کیمرہ پر کانپتی تھیں۔ میری انگلیوں کے پور وہ یوں دباتے رہتے تھے جیسے شٹر دبا رہے ہوں۔۔۔ ہمارے پیار کے سب سے زیادہ خوبصورت لمحے یہی ہوتے تھے۔

ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ نجی باتوں سے آپ کا کیا لینا دینا لیکن میں سمجھ نہیں پاتی کہ تب پھر وجوہات کو کہاں سے تلاش کریں گے؟ میری زندگی کی مٹیالی روشنی سے ہی آپ کو وجہ تلاش کر پانے میں آسانی رہے گی۔ اگر وہ لمحے نہ ہوتے تو میری زندگی میں تھا ہی کیا؟ بائیس برسوں کا ایک ویران سفر! بیکار بہتے جانا اور ہر کنارے پر سر پٹختے جانا۔

خیر، میں خاموش ہو جاتی ہوں۔

لیکن آپ ہی تو کہتے ہیں کہ ان باتوں کو رہنے دیجیے۔ ان کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ مجھ سے بولنے کو کہیں گے تو میں یونہی بولوں گی۔ آپ چاہیں تو ٹکڑے ٹکڑے سوال پوچھ لیجیے۔

جی ہاں، سرکاری جریدے میں فوٹوگرافر کے طور پر منسلک ہونے سے قبل وہ

سرکار کے پریس انفارمیشن بیورو میں تھے۔ فوٹوگرافر ہی تھے۔ میں نے کہا نا۔ انھوں نے اپنا دھندہ کبھی نہیں بدلا۔ شروع شروع میں جب وہ مجھے ذرا سی آنکھ دبا کر دیکھتے تھے تو مجھے بڑی گدگدی ہوتی تھی۔ یہ شادی کے بعد شروع دنوں کی بات ہے۔ مجھے گدگدی اس لیے ہوتی تھی کہ ایک آنکھ دبا کر دیکھنا۔۔۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔ مجھے اب بھی ہنسی آتی ہے۔ لیکن یہ اُن کی عادت بن گئی تھی۔ جی ہاں بڑی بچکانہ معلوم ہوتی ہے یہ حرکت۔۔۔ لیکن کیمرے کی وجہ سے وہ مجبور تھے۔ بعد ازاں مجھے اُن کی اس عادت سے کبھی کبھی چڑ ہوتی تھی لیکن پھر کچھ دنوں بعد میں نے جانا۔ جب بھی وہ ایک آنکھ دبا کر مجھے دیکھتے تھے تو صرف مجھے ہی دیکھ رہے ہوتے تھے۔

میں معافی چاہتی ہوں۔ کیا کروں۔ لوٹ لوٹ کر اُنھیں لمحوں پر پہنچ جاتی ہوں۔ دکھ تو اب اٹھانا ہی ہے۔ جو ہو سکا دونوں نے مل کر اٹھایا۔۔۔ لیکن اب تو دونوں کے وہی لمحے باقی ہیں جو بھولے بھٹکے کبھی آ جاتے تھے۔۔۔ ہنسی خوشی کے ایک دو لمحے۔

پریس انفارمیشن بیورو میں وہ قریب پانچ سال رہے تھے۔

قریب چھ سال ایک اشتہاری کمپنی میں۔

جی ہاں! اُنھوں نے ہار کر نوکری چھوڑ دی تھی۔ یا کہیے کہ چھڑوا دی گئی تھی۔ اُنھوں نے کوئی غیر واجب کام نہیں کیا تھا۔

ہاں! وہ سب معلومات تو آپ کے پاس ہوگی۔ سرکاری ملازمت کی رپورٹ بھی سرکار سے آ گئی ہوگی ٹھیک ہے۔ اُن کی دفتری زندگی کے بارے میں مجھے زیادہ معلوم نہیں ہے سوائے اس کے کہ شادی کے بعد شروع شروع کے سالوں میں وہ بہت جوش خروش میں رہتے تھے۔

جی، تصویروں کو لے کر!

تصویریں اور کیسی؟ وہ سرکاری فوٹوگرافر تھے۔ پندرہ اگست۔ شاندار دعوتیں۔ آنے والے غیر ملکی مہمان، لال قلعہ میں جشنِ استقبال۔ شاہی سواری۔ سنگ بنیاد رکھنے اور افتتاح۔ انھیں سب کی تصویریں ہوتی تھیں۔

پھر جس سال سے ۲۶ جنوری کا جشن شروع ہوا تب سے ضرور کچھ لڑکیوں وڑکیوں کی تصویریں بھی لینے لگے تھے۔ لوک ناچوں کی جھانکیوں کی، نیوی کے بینڈ کی۔ راشٹر

پتی کی سواری کی اور سلامی کی طرح طرح کی تصویریں ہوتی تھیں۔

ایک بات غور کرنے کی ہے۔ جب سے وہ سرکاری جریدے سے خاص طور سے جوڑ دیے گئے تو وہ لہلہاتی کھیتی، باندھ، بجلی گھر، فلٹریوں، ملوں، نئی ریلوے لائنوں، پلوں کے افتتاح، اسکولوں وغیرہ کی ہی تصویریں لیتے تھے۔ وہ بہت خوش ہوتے تھے۔۔۔ کہتے تھے۔ آزادی کا یہی سکھ ہے۔ لیکن کئی برس بعد اُن کا یہ جوش نہ جانے کہاں کھو گیا۔ اُن کے دل میں کوئی بات چبھتی رہتی تھی۔ ایک بار بولے تھے ان تصویروں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میں خود کہیں اندر سے چھوٹا پڑتا جا رہا ہوں شاید کچھ دنوں بعد کسی سے یہ بھی نہ کہہ پاؤں گا کہ تصویریں سچی ہوتی ہیں۔

جی ہاں! اُس دن پہلی مرتبہ میں نے ان کی آنکھیں بے حد سرخ دیکھی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں میں خون اتر آیا ہو۔ میں نے ترپھلا کا پانی بنانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اُن کی آنکھوں کی سرخی نہیں گئی۔

انہی دنوں ایک واقعہ ہو گیا تھا۔ تھار کے ریگستانوں کو روکنے کے متعلق کسی وزیر نے کوئی بیان دیا تھا۔ شاید یہ کہا گیا تھا کہ میلوں جنگل سیراب کر کے ریگستان کا پورب کی جانب بڑھنا روک دیا گیا ہے۔ یہ اُس جنگل کی جو تصویریں لائے اُن میں جنگل کہیں نہیں تھا۔ ریگستان ہی ریگستان تھا۔ درخت ضرور لگائے گئے تھے لیکن وہ سب سوکھ گئے تھے۔ غلطی سے تصویریں شائع ہو گئی تھیں۔ مخالف پارٹی کے کسی فرد نے اُن تصویروں کا حوالہ دے کر کچھ مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ یہ سب شاید لوک سبھا میں ہی ہوا تھا۔ وزیر صاحب کا بیان اُن تصویروں سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ آدمی سے غلطی ہو جاتی تھی۔ اُن سے بھی ہو گئی تھی لیکن اس غلطی پر انھیں بہت ڈانٹا پھٹکارا گیا۔ وزیر صاحب نے اُنھیں ملازمت سے برطرف کرنے کا آرڈر کر دیا تھا۔ اُن دنوں یہ بہت پریشان تھے۔ بس اُس کے بعد اُن کا وہاں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔

تب میں اُن کی سرخ آنکھوں سے خون کا پہلا خطرہ گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ رات بھر وہ چھٹپٹاتے رہے تھے۔ صبح اٹھے تو اُن کا تکیہ خون کے قطروں سے رنگا ہوا تھا۔

جی ہاں، خون! میں نے بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ کبھی سنا تھا لیکن یہ ہوا تھا۔
ہمارے گھر کی حالت خستہ ہو گئی تھی۔

جی ہاں! اُس کے بعد ملازمت سے یہ الگ ہوگئے تھے۔ ایک طرح سے مجبوراً اُنھیں برطرف ہونا پڑا تھا۔ تب اُنھوں نے ایک اشتہاری کمپنی میں کام کرلیا تھا۔ دو تین گھنٹے کے لیے جاتے تھے۔ کام کیا۔ ایک بہانہ تھا۔ بہ مشکل گرہستی چلتی تھی۔ تبھی بچّی پیدا ہوگئی۔

بچّی کی آمد سے ہم کچھ دنوں کے لیے تازہ دم ہوگئے تھے۔

نہیں! شراب اُنھوں نے کبھی نہیں پی۔

اشتہار کمپنی میں بھی نہیں پی!

ماڈل ساڈل لے کر کبھی گھر نہیں آئے۔

جی ہاں! کبھی گھر سے باہر نہیں رہے۔ ہر رات گھر ہی گزاری۔

جی نہیں، قسمت کے لیے کبھی الزام نہیں دھرا۔

بہت اچھی طرح پیش آئے تھے۔

تصویریں! کوئی چار چھ ہزار ہوں گی، لیکن سب سرکاری ہیں۔

ہاں! وہ بہت تکلیف کے دن تھے۔

دو سو روپیہ ملتا تھا۔

جی بالکل! اُنھیں دنوں مجھے ملازمت کرنا پڑی۔

اسکول میں!

منیجر کبھی کبھی آتے تھے۔

انھوں نے کبھی منع تو نہیں کیا۔

جی ہاں، کبھی کبھی یہ پہنچانے جاتے تھے۔

بچّی اُنھیں کے پاس رہتی تھی یہ زیادہ تر گھر پر ہی رہتے تھے۔

جی نہیں! اشتہار کمپنی کی ملازمت ختم ہو جانے کے بعد۔ جی

پھر انھوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ جی نہیں! اِدھر اُدھر اخباروں کو تصویریں بھیجتے تھے۔ گھر کے باتھ روم میں ڈارک روم بنالیا تھا، بچّی کی بھی بہت سی تصویریں لی تھیں۔ کچھ اخباروں میں بھی شائع ہوئی تھیں، مگر اُن سے آمدنی کوئی خاص نہیں تھی۔ گھر کا خرچ میری ملازمت سے نکلتا تھا۔

بھگوان کے لیے مجھے پھر ذلیل مت کیجیے۔ میں منیجر کے گھر جاتی تھی۔ لیکن اس کا

مطلب یہ تو نہیں کہ۔۔۔میں یہاں بھی تو حاضر ہو جاتی ہوں!

آپ کہتے ہیں تو میں اپنے اس جملے کے لیے معافی مانگ لیتی ہوں۔ کیا کروں! دل میں نیں اٹھتی ہے تو یہی کچھ منہ سے نکلتا ہے۔ جی! مجھے۔ جی۔۔۔ معاف۔۔۔ جی! کیا جائے۔۔۔جی! جملہ۔۔۔جی! واپس لیتی ہوں۔۔۔

میری عمر۔۔۔اُس وقت۔۔۔اب اڑتیس ہے۔ اُس وقت بتیس رہی ہو گی۔۔۔

منیجر صاحب، وہ ساٹھ کے قریب تھے۔ ہاں! کہا تھا۔ ایک بار میں نے اُنھیں بتا بھی دیا تھا کہ منیجر تمھارا صبح و شام اسکول میں آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لڑکیوں کا اسکول ہے اس لیے شاید اُنھیں کچھ برا لگا ہو، ہو سکتا ہے۔

لیکن میں پھر آپ سے کہتی ہوں۔ ان باتوں پر مت جائیے۔ یہ اصل وجہ قطعی نہیں ہیں۔ قصے کہانی کی باتیں دوسری ہوتی ہیں، یہ میری زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ اس طرح مخول مت اڑائیے۔ میرے اچھے دنوں کو گندہ مت کیجیے۔ تکلیفوں کے دن تھے مگر ہم عادی ہو گئے تھے۔ میرا محبوب۔۔۔یا منیجر۔۔۔یا وہ مدیر جو بعد ازاں اُن کے ساتھ میرے گھر آنے لگا تھا۔ وہ سب اس کام دھام کی زندگی میں کبھی سے ٹکراتے ہیں۔ کہیں وہ وکیل، دوست اور افسر ہو سکتے ہیں۔۔۔لوگ تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کوئی بھی تین یا چار یا دس ہو سکتے ہیں لیکن اس سے آپ کیا مطلب نکالنا چاہتے ہیں؟ زندگی اور موت کا فیصلہ ان معمولی وجوہات سے کیجیے گا! خواہ مخواہ کے داغ لگائیے گا!

اوہ! میں معافی چاہتی ہوں!

مدیر! وہ ایک ایسے ہی معمولی اخبار کا تھا۔

اپنے کام دھام کے سلسلے میں ہی اُن کی جان پہچان ہوئی تھی۔

جی! گرمیوں کی چھٹیوں کی تنخواہ اسکول سے نہیں ملتی تھی۔ چھٹیوں میں ہمیں برطرف کر دیا جاتا تھا۔ سیشن شروع ہونے پر پھر رکھ لیا جاتا تھا۔ چھٹی کے ان دو مہینوں میں ہماری حالت بہت خراب ہو جاتی تھی۔ تنگی بھی سامنے تھی۔

یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ اُس مدیر کی وجہ سے میں نے ملازمت چھوڑی۔ اُس مدیر کا کوئی جھگڑا صاحب سے نہیں ہوا تھا۔ میری وجہ سے بالکل نہیں۔ میں کیوں وجہ بنتی اُن کے جھگڑے کی۔ وہ مدیر ایسا تھا ہی اُن کے اخبار سے سب گھبراتے تھے۔ جھگڑے کی وجہ اخبار

تھا۔۔۔

نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرے بے قصور شوہر پر الزام مت لگایئے۔ میں جانتی ہوں آخر کار یہی الزام گھوم پھر کر مجھ پر آئے گا۔ میری بھری پوری زندگی کا بخیہ اُدھیڑے گا۔ میں بخوبی جانتی ہوں آپ لوگ مجھے کہاں ڈھکیل رہے ہیں۔ کیا قانون کا کام صرف ثبوت جمع کر کے کسی کو ذلیل کر دینا ہے؟ میں اپنے شوہر کی موت کی ذمہ دار کیسے ہو سکتی ہوں؟

آپ مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹ رہے ہیں؟ جی ہاں، اُس مدیر سے میرے شوہر کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ ٹھیک ہے۔ آپ خاص خاص الفاظ کو نوٹ کر لینا چاہتے ہیں۔ ضرور کر لیجئے۔ لیکن لفظوں سے آپ سچائی تک نہیں پہنچیں گے۔ سچائی ہمیشہ کئی طرح کی باتوں پر منحصر ہوتی ہے۔ انسان کا ماضی، حالات، ماحول، کسی خاص لمحے کی حقیقت اور سب سے زیادہ اُس کی اپنی اندرونی اذیتوں کی ٹیس پر۔ شوہر کے دکھوں یا اُس کے سکھوں کی وجہ صرف بیوی نہیں ہوتی، یہ رائے بالکل غلط ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو بے طرح چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے آزاد بھی ہوتے ہیں۔۔۔ وابستہ ہوتے ہوئے بھی جدا ہوتے ہیں۔ پانی کی لہروں کی مانند۔

جی نہیں، میں فلسفہ نہیں پڑھتی۔ کچھ لفظ سمجھ میں نہیں آئے! تواریخ، حالات، اذیت آزادی، ان کے معنی میں نہیں بتا سکتی۔ آپ براہِ مہربانی اردو۔ انگریزی ڈکشنری میں دیکھ لیں۔ ہو سکتا ہے لکھے ہوئے معنی میرے لفظوں کی گہرائی تک نہ پہنچ پائیں۔ خیر، کیا کیا جا سکتا ہے۔ جی نہیں میں تقریر نہیں کروں گی صرف واقعات بیان کرتی جاؤں گی۔

خاصی دوستی! یہ دوستی ضرورت پر بھی قائم تھی۔ ہاں وہ مدیر گھر پر کھانا کھانے بھی آتا تھا۔ میرے شوہر ہی بلاتے تھے۔ میں اُس کے ساتھ کہیں نہیں جاتی تھی۔ اُس کی نظروں میں کوئی خاص گندگی مجھے نہیں معلوم ہوتی تھی جس کو آپ شاید گندگی کہنا چاہیں گے۔ وہ سب کی نظروں میں ہوتی ہے۔ اس کو آپ مرد عورت کے درمیان کا معمولی تناؤ کہہ سکتے ہیں۔۔۔ اور اس تناؤ کو اگر گندہ اور چھپایا برا نہ مانا جائے تو وہ بڑی معمولی سی چیز ہے۔ اپنے کو شیشے میں دیکھتے رہنے کی طرح۔ ہر آدمی ہر عورت کے آئینے میں اپنے کو دیکھتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس میں عمر یا تعلقات کا ہاتھ ہو۔

یہ خبر آپ کو غلط دی گئی ہے۔ چھٹیاں ختم ہو جانے کے بعد مجھے اسکول میں پھر رکھ لیا گیا تھا۔ جی نہیں! میں نے مدیر اور منیجر کے جھگڑے کی وجہ سے ملازمت نہیں چھوڑی ---- یہ سراسر غلط ہے۔

اس کے اخبار میں بھانڈا پھوڑ قسم کی رپورٹیں شائع ہوا کرتی ہیں۔

مدیر نے منیجر کے کارناموں کو لے کر کوئی رپورٹ نہ تو لکھی تھی نہ چھاپی تھی۔ اُس نے بلیک میل نہیں کیا تھا آپ اس کو میرا رجحان کیسے کہہ سکتے ہیں؟ مدیر کو بچانا یا اُس کی نیت کو صاف بتانا صرف ایک سچائی نہیں ہے۔ اُس کو آپ میرے دل کی کمزوری کہہ سکتے ہیں؟ یوں عورت کا دل ہر کمزوری کی جانب کمزور ہوتا ہے۔ یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ میرے شوہر نے کسی طرح کا سمجھوتہ کر لیا تھا۔ آپ اُن کی موت کے اصلی وجوہات کو اتنی چھوٹی اور بیہودہ باتوں سے کیوں وابستہ کر رہے ہیں؟ اگر آپ سمجھ سکیں تو میں کچھ اُن کے بارے میں بیان کروں۔۔۔

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اُن کی آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں۔ غلط تصویریں شائع کیے جانے کے بعد اُن کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا۔ اس کو وہ برداشت نہیں کر پائے تھے۔ اُن کا یقین اپنے کام سے اُٹھ گیا تھا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ جب آدمی کا یقین اپنے کام سے اٹھ جائے تو اُس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ وہ تصویریں جو انھیں یقین دلاتی تھیں یکایک اُن کا یقین توڑ گئی تھیں۔ کیونکہ اُن کو سچائی سے کاٹ دیا گیا تھا۔ وہ وہی کہہ سکتے تھے جو دوسرے چاہتے تھے۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد اُن کی آنکھوں سے خون کے قطرے پہلی بار گرے تھے۔

آپ چاہتے ہیں تو آنسو کہہ لیجئے لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں قطعی بڑھا چڑھا کر نہیں کہہ رہی ہوں۔ سچ مچ وہ خون کے قطرے تھے۔ جی ہاں! کبھی کبھی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو نہ پہلے دیکھی ہوئی ہوتی ہیں نہ سنی ہوئی۔ وہ بس عجیب ہوتی ہیں۔

خیر ۔۔۔ اُن دنوں میں کام پر جانے لگی تھی۔ یہ گھر میں بچّی کے ساتھ وقت گزارا کرتے تھے۔ اُس دن اتوار تھا۔ انھوں نے بچّی کو پڑوس میں کھیلنے کو بھیج دیا تھا۔ نہیں جھگڑے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اُلٹے اس دن وہ بہت پیار میں بھرے ہوئے تھے۔ بہت دنوں بعد انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انگلیوں کو شکر کی طرح دبایا تھا۔

انھوں نے مجھ سے بریزر اتارنے کو کہا تھا۔ میں تھوڑا ہچکچائی تھی۔ دن کا وقت

تھا۔ وہ کیمرہ لیے بیٹھے تھے۔ پھر انھوں نے مجھے وائل کی پتلی ساڑی پہننے کو کہا تھا۔ مجھے طرح طرح سے بٹھایا اور لٹایا تھا اور تصویریں لی تھیں۔ اُس وقت اُن کی ایک آنکھ حسب معمول کانپ رہی تھی۔ میں سمجھ گئی تھی۔ وہ صرف مجھے دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت جب وہ کام میں محو تھے۔۔۔ جی اپنے میں ڈوبے ہوئے تھے تب بھی آٹھ دس بار اُن کی آنکھوں سے خون کے قطرے ٹپکے تھے۔ انھوں نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ خود بھی بے طرح تھک گئے تھے۔ اس کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئے تھے اور چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے تاکتے رہے تھے۔ میں کپڑے پہن کر انھیں چائے دینے آئی تھی تو ان کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ اس وقت مجھے ڈر بھی لگا تھا کہ کہیں اگر انھوں نے پیار سے دیکھنے کے لیے پلکیں جھپکائیں تو تھما ہوا خون بہہ جائے گا۔ چائے میں نے سرہانے تپائی پر رکھ دی تھی۔ وہ وہیں رکھے رکھے ٹھنڈی ہوگئی تھی۔

کھانا کھاتے وقت وہ کہہ رہے تھے کہ کچھ کمائی ہو جائے تو ایک نئی لینس خریدنا چاہتے ہیں تاکہ بازار کے لائق کام کر سکیں۔ اسی کے لیے انھیں کچھ روپے کی ضرورت تھی۔ یوں گھر میری تنخواہ سے گھسٹ بھر رہا تھا۔ ضرورت تو تب بھی پڑتی تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ کارش، سی گلٹز، سانئش، اسٹینڈ، ویسٹن، سمتھ، او بروان، پال، کاشی ناتھ پارکھ وغیرہ کے نام برابر لے رہے تھے۔

نہیں، نہیں۔ غلط مت سمجھیے۔ یہ میرے دوستوں یا چاہنے والوں کے نام نہیں ہیں۔ آپ لوگ ہمیشہ غلط رشتے جوڑتے ہیں۔۔۔ ہمیشہ آدمی کے وجود پر شک کرتے ہیں۔۔۔ وجود!۔۔۔ جی! یہ آدمی کی اپنی زندگی کے قانون کا لفظ ہے۔ یہ آپ کو کتابوں میں نہیں ملے گا۔ خیر۔۔۔ شام کو ہی انھوں نے فلم ڈیولپ کر کے پرنٹ بنا لیے تھے۔ پرنٹ دیکھتے ہوئے وہ بھی سنجیدہ تھے۔ مجھے نہیں معلوم۔ اُن کو کیا ہوا تھا میری وہ تصویریں لے کر وہ شیشے کے سامنے کھڑے تھے۔ تصویریں دیکھتے تھے اور اپنا منہ آئینے میں دیکھتے جاتے تھے۔

بس اسی وقت اُن کی آنکھوں سے خون کی دھار بہنے لگی تھی، اُس شام سے جو خون ٹپکنا شروع ہوا پھر نہیں رکا۔ جب تک وہ زندہ رہے مسلسل خون ٹپکتا رہا۔

مدیر نے میری وہ تصویریں اگلے دن چھاپی تھیں۔ بس یہیں سے ہنگامہ شروع ہوا تھا۔ میری وہ نیم عریاں تصویریں اسکول کے منیجر تک بھی پہنچی تھیں۔ انھوں نے فوراً طے کیا تھا کہ اس طرح کی عورت کا اسکول میں رہنا ایک لمحہ کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ مجھے

اُس وقت کا اِس سے بڑا یا گیا اور کھرے کھرے حساب کر دیا گیا تھا۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسکول سے نکالے جانے کی وجہ کیا تھی! مدیر اور منیجر کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ مجھے لے کر اُن میں کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میرے اور مدیر کے تعلقات کو لے کر بھی کچھ سوچنا یا سمجھنا قطعی غیر ضروری ہے۔ اُن کی موت کی وجہ ان سطحی وجوہات میں مت تلاش کیجیے۔

جی، خون کی دھار کی وجہ میں کیا بتا سکتی ہوں؟ جو باتیں میرے بس میں نہیں ہیں۔ اُن کے نتیجوں کو میں صرف دیکھ سکتی ہوں۔۔۔ کیا کر سکتی ہوں اگر بہت معمولی طرح سے سوچیے تو وجوہات میں ہو سکتی ہوں۔ وہ خود ہو سکتے ہیں۔ وہ تصویریں بھی ہو سکتی ہیں اور وہ آئینہ بھی ہو سکتا ہے جس میں بار بار وہ اپنی شکل دیکھ رہے تھے۔ نتیجوں اور وجوہات تک پہنچنے کا یہی سب سے آسان طریقہ ہو سکتا ہے کہ ساری ذمہ داری اُن چار چیزوں پر تھوپ دی جائے میں وہ تصویریں اور آئینہ اسے صحیح ثابت کرنے کے لیے ضرورت پڑے تو میرے نام نہاد محبوب بشن منیجر صاحب یا مدیر کو ضرورت کے مطابق جوڑ لیا جائے، میں اور کیا کہہ سکتی ہوں؟ مجھے مجرم ٹھہرا دیجیے۔

جی، میں اُس وقت گھر میں نہیں تھی۔

بچّی۔ بچّی اُنھیں بہت پیار کرتی تھی۔ جی ہاں! بچّی نے بھی ان کی آنکھوں سے لگاتار خون کی دھار گرتی دیکھی تھی۔ وہ بہت ڈر گئی تھی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا تھا۔۔ ممی، پاپا کی آنکھوں سے خون کیوں گرتا ہے؟ میں نے پیار سے سمجھا دیا تھا۔ بیٹے تیرے پاپا کی طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ اُن کو کچھ بیماری ہو گئی ہے۔

بچّی میری بات سے مطمئن نہیں تھی۔ اُس نے اُن سے پوچھا تھا اُنھوں نے بھی یہی کہا تھا میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اُس دن سے بچّی کا ڈر ختم ہو گیا تھا۔ خون کی دھار گرتی رہتی تھی اور وہ اُن کی گود یا گلے میں لپٹ کر پیار کرتی رہتی تھی کبھی اپنے ننّھے ننّھے ہاتھوں سے بہتے ہوئے خون کو پونچھ دیتی تھی۔

میں نے بتایا نا، میں ایک جگہ کام تلاش کرنے کے سلسلے میں گیارہ بجے سے گئی ہوئی تھی۔ بچّی پڑھنے اسکول گئی تھی۔ وہ گھر پہ تنہا تھے۔

جی ہاں ملازمت چھوٹنے کے بعد دوسرے دن کی بات ہے۔ مجھ کو اُس حادثے کا

کوئی احساس نہیں تھا۔ جب میں گئی تھی تب خون ذرا زیادہ ہی گر رہا تھا لیکن یہ تو معمول اور روزانہ کی بات تھی۔

جی، انھوں نے چھت کے کڑے سے لٹک کر پھانسی لگائی تھی۔ رسّی۔ رسّی کہاں تھی؟ چادر تھی۔

مجھ کو کوئی خبر نہیں ملی۔ کوئی مجھ کو کہاں خبر دیتا؟ میں چار بجے کے قریب واپس آئی تب سب کچھ ہو چکا تھا۔ پولیس آچکی تھی۔ ان کی لاش کو اتار پلنگ پر لٹا دیا گیا تھا۔ جی نہیں! جس چادر سے اُنھوں نے پھانسی لگائی تھی وہ وہیں لٹکی ہوئی تھی۔ اُن کو دوسری چادر اڑھادی گئی تھی۔ پاس پڑوس کے لوگ جاچکے تھے۔ صرف ایک پڑوسی پریشان سے گھوم رہے تھے جب میں آئی تو پولیس کا ایک آدمی پہرے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر بھی میں کچھ نہیں سمجھ پائی تھی۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے۔

سب سے پہلے کس نے بتایا؟ میری بچّی نے۔ جی ہاں وہ اسکول سے دو بجے آجاتی ہے۔ وہ مجھ سے پہلے آگئی تھی۔ وہ باہر کھڑی تھی حسب معمول۔ مجھ کو دیکھتے ہی وہ دوڑ کے آئی تھی اور میری ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ میں نے اُس کو پیار کیا تھا۔ لیکن وہ کچھ بات کہنے کے لیے بیتاب تھی۔ وہ ایک دم چہک کر بولی تھی، ''ممّی! ممّی! پاپا کی طبیعت اچھی ہو گئی، وہ آرام سے لیٹے ہیں۔۔۔''

جی، بچّی نے سب سے پہلے بتایا تھا۔ میں کمرے میں پہنچی تو سب سمجھ میں آگیا تھا۔ میں دیوار سے سر پٹک دینے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔

وہ بے حس و حرکت دراز تھے۔ ناخن اور ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ بدن پیلیا کے مریض کی طرح پیلا پیلا تھا۔ ہاں! آنکھیں بند تھیں اور بالکل سوکھی ہوئیں۔ اُن میں خون کی نمی تک نہیں تھی۔ ریت میں پڑی سیپ کی طرح۔

اُس کے بعد جو کچھ ہوا۔۔۔ اُس کی تفصیل آپ کے پاس ہے ہی۔ خودکشی سے پہلے کی جو باتیں تھیں وہ میں نے سامنے رکھ دی ہیں۔

فیصلہ کچھ تو ہوگا ہی۔ اور وہ آدمی کے خلاف ہی ہو سکتا ہے۔

جی، آدمی یعنی اکیلا آدمی۔ جیسی اکیلی میں۔۔۔ یا آپ یا آپ۔۔۔

●●

کملیشور ہندی کے مایہ ناز ادیب، صحافی اور فلم رائٹر ہیں۔ اب تک ان کی کہانیوں کے ۱۱ مجموعے، ۱۰ ناول اور دیگر بیس کتابیں، تنقید، سفرنامے، خودنوشت، یادنوشت وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ 'نئی کہانیاں'، 'ساریکا'، 'گنگا'، 'کتھا یاترا' 'اِنگت'، 'شری ورشا' 'دینک جاگرن' اخباروں کے کامیاب مدیر رہے ہیں۔ آجکل دینک بھاسکر (راجستھان) کے چیف ایڈیٹر ہیں۔

'امانش'، 'سارا آکاش'، 'پھر بھی'، 'اس کے بعد'، مسٹر نٹور لال'، 'دی برننگ ٹرین'، 'رام بلرام'، 'موسم'، 'سوتن'، 'آندھی'، 'پتی پتنی' اور وہ' جیسی کامیاب ۹۹ ہندی فلموں کے رائٹر ہیں۔

عام آدمی کے دکھ درد کا پروگرام 'پریکرما' جو مسلسل سات سال تک ہر ہفتہ بمبئی دوردرشن پر جاری رہا، ہندوستانی کہانیوں پر مبنی پہلا ادبی سیریل 'درپن'، اس کے علاوہ 'آکاش گنگا'، 'ریت پر لکھے نام'، 'بکھرے پنے'، 'وِراٹ'، 'بیتال پچیسی'، 'یگ' اور 'چندر کانتا' جیسے کامیاب سیریلوں کے مصنف ہیں۔ حال ہی میں مطبوعہ ناول 'کتنے پاکستان' ان دنوں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔

خورشید عالم اردو کے افسانہ نگار اور ادیب ہیں۔ ہندی پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ اردو اور ہندی میں چوبیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف، مرتب اور مترجم ہیں، جن میں وشنو پربھاکر کا ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ناول 'اردھ ناریشور' بہترین ہندی کہانیوں کا انتخاب 'ہندی کہانیاں'، 'ہندی ادب کی تاریخ' اور کملیشور کا مشہور ہندی ناول 'کتنے پاکستان' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستانی افسانہ نگار انتظار حسین کے افسانوں کا مجموعہ 'خالی پنجرہ' اور 'دھوپ ایک چادر' اور 'بھٹکے ہوئے لوگ' شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔

ISBN 81-260-1311-7

۵۰ روپے